نئی روشنی کی تاریکیاں

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ہماری ذہنی غلامی اور اس کے اسباب

حکومت و فرماں روائی اور غلبہ و استیلاء کی دو قسمیں ہیں۔ ایک ذہنی اور اخلاقی غلبہ، دوسرا سیاسی اور مادی غلبہ۔ پہلی قسم کا غلبہ یہ ہے کہ ایک قوم اپنی فطری قوتوں میں اتنی ترقی کر جائے کہ دوسری قومیں اسی کے افکار پر ایمان لے آئیں۔ اسی کے تخیلات، اسی کے معتقدات، اسی کے نظریات دماغ پر چھا جائیں۔ ذہنیتیں اسی سانچے میں ڈھلیں، تہذیب اسی کی تہذیب ہو، علم اسی کا علم ہو۔ اسی کی تحقیق کو تحقیق سمجھا جائے اور ہر وہ چیز باطل ٹھیرائی جائے، جس کو وہ باطل ٹھیرائے۔ دوسری قسم کا غلبہ یہ ہے کہ ایک قوم اپنی مادی طاقتوں کے اعتبار سے اتنی قوی بازو ہو جائے کہ دوسری قومیں اس کے مقابلے میں اپنی سیاسی آزادی کو برقرار نہ رکھ سکیں اور کلی طور پر یا کسی نہ کسی حد تک وہ غیر قوموں کے وسائل ثروت پر قابض اور ان کے نظمِ مملکت پر حاوی ہو جائے۔ اس کے مقابلے میں مغلوبیت اور محکومیت کی بھی دو قسمیں ہیں۔ ایک ذہنی مغلوبیت، دوسری سیاسی مغلوبیت۔ ان دونوں قسموں کی صفات کو ان صفات کا عکس سمجھ لیجیے جو اوپر غلبہ کی دونوں قسموں کے متعلق بیان کی گئی ہیں۔

یہ دونوں قسمیں ایک اعتبار سے الگ الگ ہیں۔ لازم نہیں ہے کہ جہاں ذہنی غلبہ ہو وہاں سیاسی غلبہ بھی ہو، اور نہ یہ لازم ہے کہ جہاں سیاسی غلبہ ہو وہاں ذہنی غلبہ بھی ہو۔ لیکن فطری قانون یہ ہے کہ جو قوم عقل و فکر سے کام لیتی اور تحقیق و اکتشافات کی راہ میں پیش قدمی کرتی ہے،

اس کو ذہنی ترقی کے ساتھ ساتھ مادّی ترقی بھی نصیب ہوتی ہے اور جو قوم تفکّر و تدبر کے میدان میں مسابقت کرنا چھوڑ دیتی ہے وہ ذہنی انحطاط کے ساتھ مادّی تنزل میں بھی مبتلا ہو جاتی ہے۔ پھر چوں کہ غلبہ نتیجہ ہے قوت کا، اور مغلوبیت نتیجہ ہے کم زوری کا۔ اس لیے ذہنی و مادّی حیثیت سے درماندہ اور ضعیف قومیں اپنی درماندگی اور ضعف میں جس قدر ترقی کرتی جاتی ہیں اسی قدر وہ غلامی اور محکومیت کے لیے مستعد ہوتی چلی جاتی ہیں۔ اور ذہنی اور مادّی دونوں حیثیتوں سے طاقت ور قومیں ان کے دماغ اور ان کے جسم دونوں پر حکمراں ہو جاتی ہیں۔

مسلمان آج کل دُہری غلامی میں مبتلا ہیں۔ کہیں دونوں قسموں کی غلامیاں پوری طرح مسلّط ہیں اور کہیں سیاسی غلامی کم اور ذہنی غلامی زیادہ ہے۔ بد قسمتی سے اس وقت کوئی اسلامی آبادی ایسی نہیں ہے جو صحیح معنوں میں سیاسی اور ذہنی اعتبار سے پوری طرح آزاد ہو۔ جہاں ان کو سیاسی استقلال اور خود اختیاری حاصل بھی ہے۔ وہاں وہ ذہنی غلامی سے آزاد نہیں ہیں۔ ان کے مدرسے، ان کے دفتر، ان کے بازار، ان کی سوسائٹی، ان کے گھر، حتیٰ کہ ان کے جسم تک اپنی زبانِ حال سے شہادت دے رہے ہیں کہ ان پر مغرب کی تہذیب، مغرب کے افکار، مغرب کے علوم و فنون حکمراں ہیں۔ وہ مغرب کے دماغ سے سوچتے ہیں، مغرب کی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ مغرب کی بنائی ہوئی راہوں پر چلتے ہیں۔ خواہ ان کو اس کا شعور ہو یا نہ ہو۔ بہ ہر صورت یہ مفروضہ ان کے دماغوں پر مسلّط ہے کہ حق وہ ہے جس کو مغرب حق سمجھتا ہے، اور باطل وہ ہے جس کو مغرب نے باطل قرار دیا ہے۔ حق، صداقت، تہذیب، اخلاق، انسانیت اور شائستگی ہر ایک کا معیار ان کے نزدیک وہی ہے جو مغرب نے مقرر کر رکھا ہے۔ اپنے دین و ایمان، اپنے افکار و تخیلات، اپنی تہذیب و شائستگی، اپنے اخلاق و آداب، سب کو وہ اسی معیار پر جانچتے ہیں۔ جو چیز اس معیار پر پوری اُترتی ہے اسے درست سمجھتے ہیں، مطمئن ہوتے ہیں، فخر کرتے ہیں کہ ہماری فلاں چیز مغرب کے معیار پر پوری اتر آئی۔ اور جو چیز اس معیار پر پوری نہیں اترتی اسے شعوری یا غیر شعوری طور پر غلط مان لیتے ہیں۔ کوئی علانیہ اس کو ٹھکرا دیتا ہے کوئی دل میں گھٹتا ہے اور کوشش کرتا ہے کہ کسی نہ کسی طرح کھینچ تان کر اسے مغربی معیار کے مطابق کر دے۔

جب ہماری آزاد قوموں کا یہ حال ہے، تو جو مسلمان قومیں مغربی اقوام کی محکوم ہیں ان کی ذہنی غلامی کا کیا پوچھنا۔

اس غلامی کا سبب کیا ہے؟ اس کی تشریح کے لیے ایک کتاب کی وسعت درکار ہے، مگر مختصراً اس کو چند لفظوں میں بیان کیا جاسکتا ہے۔

ذہنی غلبہ و استیلاء کی بنا دراصل فکری اجتہاد اور علمی تحقیق پر قائم ہوتی ہے۔ جو قوم اس راہ میں پیش قدمی کرتی ہے وہی دنیا کی رہ نما اور قوموں کی امام بن جاتی ہے اور اسی کے افکار دنیا پر چھا جاتے ہیں۔ اور جو قوم اس راہ میں پیچھے رہ جاتی ہے، اسے مقلّد و متبع بننا پڑتا ہے۔ اس کے افکار و معتقدات میں یہ قوت باقی نہیں رہتی کہ وہ دماغوں پر اپنا تسلّط قائم رکھ سکیں۔ مجتہد و محقق قوم کے افکار و معتقدات کا سیلاب ان کو بہالے جاتا ہے اور ان میں اتنا بل بوتا بھی نہیں رہتا کہ اپنی جگہ پر ٹھیرے رہ جائیں۔ مسلمان جب تحقیق و اجتہاد کے میدان میں آگے بڑھتے رہے، تمام دنیا کی قومیں ان کی پیرو اور مقلّد رہیں۔ اسلامی فکر ساری نوع انسانی کے افکار پر غالب رہی۔ حسن اور قبح، نیکی اور بدی، غلط اور صحیح کا جو معیار اسلام نے مقرر کیا وہ شعوری یا غیر شعوری طور پر تمام دنیا کے نزدیک معیار قرار پایا اور قصداً یا اضطراراً دنیا اپنے افکار و اعمال کو اسی معیار کے مطابق ڈھالتی رہی۔ مگر جب مسلمانوں میں اربابِ فکر اور اصحابِ تحقیق پیدا ہونے بند ہو گئے، جب انھوں نے سوچنا اور دریافت کرنا چھوڑ دیا، جب وہ اکتسابِ علم اور اجتہادِ فکر کی راہ میں تھک کر بیٹھ گئے تو گویا انھوں نے خود دنیا کی رہ نمائی سے استعفا دے دیا۔ دوسری طرف مغربی قومیں اس راہ میں آگے بڑھیں۔ انھوں نے غور و فکر کی قوتوں سے کام لینا شروع کیا۔ کائنات کے راز ٹٹولے اور فطرت کی چھپی ہوئی طاقتوں کے خزانے تلاش کیے۔ اس کا لازمی نتیجہ وہی ہوا جو ہونا چاہیے تھا۔ مغربی قومیں دنیا کی رہ نما بن گئیں اور مسلمانوں کو اسی طرح ان کے اقتدار کے آگے سرِ تسلیم خم کرنا پڑا، جس طرح کبھی دنیا نے خود مسلمانوں کے اقتدار کے آگے خم کیا تھا۔

چار پانچ سو سال تک مسلمان اپنے بزرگوں کے بچھائے ہوئے بستر پر آرام سے سوتے رہے، اور مغربی قومیں اپنے کام میں مشغول رہیں۔ اس کے بعد دفعتاً مغربی اقتدار کا سیلاب اٹھا اور ایک صدی کے اندر اندر تمام روئے زمین پر چھا گیا۔ نیند کے متوالے آنکھیں ملتے ہوئے اٹھے تو دیکھا کہ مسیحی یورپ قلم اور تلوار دونوں سے مسلح ہے اور دونوں طاقتوں سے دنیا پر حکومت کر رہا ہے۔ ایک چھوٹی سی جماعت نے مدافعت کی کوشش کی۔ مگر نہ قلم کا زور تھا، نہ تلوار کا۔ شکست پر شکست کھاتی چلی گئی۔ رہا قوم کا سوادِ اعظم تو اس نے اسی سنت پر عمل کیا جو ہمیشہ سے

کمزوروں کی سنت رہی ہے۔ تلوار کے زور، استدلال کی قوت، عملی شواہد کی تائید اور نظر فریب حسن و جمال کے ساتھ جو خیالات، نظریات اور اصول مغرب سے آئے، آرام طلب دماغوں اور مرعوب ذہنیتوں نے ان کو ایمان کا درجہ دے دیا۔ پرانے مذہبی معتقدات، اخلاقی اصول اور تمدنی آئین جو محض روایتی بنیادوں پر قائم رہ گئے تھے۔ اس نئے طاقت ور سیلاب کی رو میں بہتے چلے گئے، اور ایک غیر محسوس طریقے سے دلوں میں یہ مفروضہ جاگزیں ہو گیا کہ جو کچھ مغرب سے آتا ہے وہی حق ہے اور وہی صحت و درستی کا معیار ہے۔

مغربی تہذیب کے ساتھ جن قوموں کا تصادم ہوا ان میں سے بعض تو وہ تھیں جن کی کوئی مستقل تہذیب نہ تھی۔ بعض وہ تھیں جن کے پاس اپنی ایک تہذیب تو تھی مگر ایسی مضبوط نہ تھی کہ کسی دوسری تہذیب کے مقابلے میں وہ اپنے خصائص کو برقرار رکھنے کی کوشش کرتیں۔ بعض وہ تھیں جن کی تہذیب اپنے اصول میں اس آنے والی تہذیب سے کچھ بہت زیادہ مختلف نہ تھی۔ ایسی تمام قومیں تو بہت آسانی سے مغربی تہذیب کے رنگ میں رنگ گئیں اور کسی شدید تصادم کی نوبت نہ آنے پائی۔ لیکن مسلمانوں کا معاملہ ان سب سے مختلف ہے۔ یہ ایک مستقل اور مکمل تہذیب کے مالک ہیں، ان کی تہذیب اپنا ایک مکمل ضابطہ رکھتی ہے جو فکری اور عملی دونوں حیثیتوں سے زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی ہے اور بدقسمتی سے مغربی تہذیب کے اساسی اصول کلیتہً اس تہذیب کے مخالف واقع ہوئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قدم قدم پر یہ دونوں تہذیبیں ایک دوسرے سے ٹکرا رہی ہیں اور ان کے تصادم سے مسلمانوں کی اعتقادی اور عملی زندگی کے ہر شعبے پر نہایت تباہ کن اثر پڑ رہا ہے۔

مغربی تہذیب نے جس فلسفہ اور سائنس کی آغوش میں پرورش پائی ہے وہ پانچ چھ سو سال سے دہریت، الحاد، لامذہبی اور مادّہ پرستی کی طرف جا رہے ہیں۔ وہ جس تاریخ سے پیدا ہوئی اسی تاریخ سے مذہب کے ساتھ اس کی لڑائی شروع ہوگئی بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ مذہب کے خلاف عقل و حکمت کی لڑائی ہی نے اس کی تہذیب کو پیدا کیا۔ اگرچہ کائنات کے آثار کا مشاہدہ، ان کے اسرار کی تحقیق، ان کے کلی قوانین کی دریافت، ان کے مظاہر پر غور و فکر اور ان کو ترتیب دے کر قیاس و برہان کے ذریعے سے نتائج کا استنباط، کوئی چیز بھی مذہب کی ضد نہیں ہے۔ مگر سوئے اتفاق سے نشاۃِ جدیدہ (Renaissance) کے عہد میں جب یورپ کی نئی علمی تحریک رونما ہوئی تو اس

تحریک کا مقابلہ ان عیسائی پادریوں سے ہوا جنھوں نے اپنے مذہبی معتقدات کو قدیم یونانی فلسفہ و حکمت کی بنیادوں پر قائم کر رکھا تھا۔ اور جو یہ سمجھتے تھے کہ اگر جدید علمی تحقیقات اور فکری اجتہاد سے ان بنیادوں میں ذرا سا بھی تزلزل واقع ہوا تو اصل مذہب کی عمارت پیوندِ خاک ہو جائے گی۔ اس غلط تخیل کے زیرِ اثر انھوں نے نئی علمی تحریک کی مخالفت کی اور اس کے روکنے کے لیے قوت سے کام لیا۔ مذہبی عدالتیں (Inquisitions) قائم کی گئیں جن میں اس تحریک کے علم برداروں کو سخت وحشیانہ اور ہول ناک سزائیں دی گئیں۔ لیکن یہ تحریک ایک حقیقی بے داری کا نتیجہ تھی اس لیے تشدد سے دبنے کے بہ جائے اور بڑھتی چلی گئی۔ حتیٰ کہ حریتِ فکر کے سیلاب نے مذہبی اقتدار کا خاتمہ کر دیا۔

ابتدا میں لڑائی حریتِ فکر کے علم برداروں اور مذہبی پیشواؤں کے درمیان تھی مگر چوں کہ مذہبی پیشوا مذہب کے نام پر آزاد خیالوں سے جنگ کر رہے تھے۔ اس لیے بہت جلدی اس لڑائی نے مسیحیت اور آزاد خیالی کے درمیان جنگ کی صورت اختیار کر لی۔ اس کے بعد نفس مذہب (خواہ وہ کوئی مذہب ہو) اس تحریک کا مدِ مقابل قرار پا گیا۔ سائینٹفک طریقے پر سوچنے کے معنیٰ یہ قرار پائے کہ یہ طریقِ فکر مذہبی طریقِ فکر کی عین ضد ہے۔ جو شخص سائینٹفک طریق سے کائنات کے مسائل پر غور کرے اس پر لازم ہے کہ مذہبی نظریے سے ہٹ کر اپنی راہ نکالے۔ کائنات کے مذہبی نظریے کا بنیادی تخیل یہ ہے کہ عالمِ طبیعت (Physical World) کے آثار اور جملہ مظاہر کی علت کسی ایسی طاقت کو قرار دیا جائے جو اس عالم سے بالاتر ہو۔ یہ نظریہ چوں کہ جدید علمی تحریک کے دشمنوں کا نظریہ تھا، اس لیے جدید تحریک کے علم برداروں نے لازم سمجھا کہ خدا یا کسی مافوق الطبیعت (Supernatural) ہستی کو فرض کیے بغیر کائنات کے معمے کو حل کرنے کی کوشش کریں اور ہر اس طریقے کو خلافِ حکمت (Unsientific) قرار دیں، جس میں خدا کا وجود فرض کر کے مسائلِ کائنات پر نظر کی گئی ہو۔ اس طرح نئے دور کے اہلِ حکمت و فلسفہ میں خدا اور روح یا روحانیت اور فوق الطبیعت کے خلاف ایک تعصب پیدا ہو گیا، جو عقل و استدلال کا نتیجہ نہ تھا۔ بلکہ سراسر جذبات کی برانگیختگی کا نتیجہ تھا۔ وہ خدا سے اس لیے تبری نہ کرتے تھے کہ دلائل و براہین سے اس کا عدمِ وجوب ثابت ہو گیا تھا۔ بلکہ اس سے بے زار تھے کہ وہ ان کی آزادیِ خیال

کے دشمنوں کا معبود تھا۔ بعد کی پانچ صدیوں میں ان کی عقل وفکر اور ان کی علمی جدوجہد نے جتنا کام کیا اس کی بنیاد میں یہی غیر عقلی جذبہ تھا۔

مغربی فلسفہ اور مغربی سائنس دونوں نے جب سفر شروع کیا تو اگرچہ ان کا رُخ خدا پرستی کے بالکل مخالف سمت میں تھا تاہم چوں کہ وہ مذہبی ماحول میں گھرے ہوئے تھے اس لیے وہ ابتداءً نیچریت (Naturalism) کو خدا پرستی کے ساتھ ساتھ نباہتے رہے۔ مگر جوں جوں وہ اپنے سفر میں آگے بڑھتے گئے، نیچریت، خدا پرستی پر غالب آتی چلی گئی۔ حتیٰ کہ خدا کا تخیل، اور خدا کے ساتھ ہر اس چیز کا تخیل جو عالم طبیعت سے بالاتر ہو، ان سے بالکل غائب ہوگیا۔ اور وہ اس انتہا پر پہنچ گئے کہ مادّہ وحرکت کے سوا کوئی شے ان کے نزدیک حقیقی نہ رہی۔ سائنس نیچریت کا ہم معنیٰ قرار پا گیا اور اہلِ حکمت وفلسفہ کا ایمان اس نظریے پر قائم ہوگیا کہ ہر چیز جو ناپی اور تولی نہیں جاسکتی اس کی کوئی حقیقت ہی نہیں ہے۔

مغربی فلسفہ وسائنس کی تاریخ اس بیان کی شاہد ہے۔ ڈیکارٹ (Descartes) متوفی ۱۹۵۰ جو مغربی فلسفے کا آدم سمجھا جاتا ہے ایک طرف تو خدا کا زبردست قائل ہے اور مادّہ کے ساتھ روح کا مستقل وجود بھی مانتا ہے۔ مگر دوسری طرف وہی ہے جس نے عالمِ طبیعت کے آثار کی توجیہ میکانکی (Mechanical) طریق پر کرنے کی ابتدائی کی اور طریقِ فکر کی بنا رکھی جو بعد میں سراسر مادّہ پرستی (Materialism) بن گیا۔ ہابس (Hobbes) متوفی ۱۶۷۹ اس سے ایک قدم اور آگے بڑھا کر فوق الطبیعت (Supernatural) ہستی کی کھلم کھلاّ مخالفت کرتا ہے۔ نظامِ عالم اور اس کی ہر شے کو میکانکی توجیہہ کے قابل قرار دیتا ہے اور کسی ایسی نفسی یا روحی یا عقلی قوت کا قائل نہیں ہے، جو اس مادّی دنیا میں تصرف کرنے والی ہو مگر اس کے ساتھ ہی وہ خدا کو بھی مانتا ہے۔ اس حیثیت سے کہ ایسی ایک علت العلل کا ماننا ایک عقلی ضرورت ہے۔ اسی زمانے میں اسپائنوزا (Spinoza) ۱۶۷۷ میں اٹھا جو سترہویں صدی میں عقلیت (Rationalism) کا سب سے بڑا علم بردار تھا۔ اس نے مادّہ اور روح اور خدا کے درمیان کوئی فرق نہ رکھا۔ خدا اور کائنات کو ملا کر ایک کل بنادیا اور اس کل میں خدا کے اختیارِ مطلق کو تسلیم نہ کیا۔ لائبنیز (Leibnitz) ۱۷۱۶ اور لاک (Locke) ۱۷۰۴ خدا کے قائل تھے، مگر دونوں کا میلان نیچریت کی جانب تھا۔

یہ سترہویں صدی کا فلسفہ تھا، جس میں خدا پرستی اور نیچریت دونوں ساتھ ساتھ چل رہی

تھیں۔ اسی طرح سائنس نے بھی سترہویں صدی تک کامل الحاد کا رنگ اختیار نہیں کیا۔ کوپرنیکس (Copernicus)، کپلر (Kepler)، گیلیلیو (Galileo)، نیوٹن (Newton) اور سائنس کے دوسرے علم برداروں میں سے کوئی بھی خدا کا منکر نہ تھا۔ مگر یہ کائنات کے اسرار کی جستجو میں الٰہی نظریے سے قطع نظر کر کے ان قوتوں کو تلاش کرنا چاہتے تھے جو اس نظام کو چلا رہی ہیں اور ان قوانین کو معلوم کرنے کے خواہش مند تھے جن کے تحت یہ نظام چل رہا ہے۔ یہ الٰہی نظریے سے قطع نظر کرنا ہی دراصل اس دہریت اور نیچریت کا تخم تھا، جو بعد میں حریتِ فکر کے درخت سے پیدا ہوئی۔ لیکن سترہویں صدی کے حکما کو اس کا شعور نہ تھا۔ وہ نیچریت اور خدا پرستی میں کوئی خطِ امتیاز نہ کھینچ سکے، اور یہی سمجھتے رہے کہ یہ دونوں ایک ساتھ نبھ سکتی ہیں۔

اٹھارہویں صدی میں یہ حقیقت نمایاں ہوگئی کہ جو طریقِ فکر خدا کی ہستی کو نظر انداز کر کے نظامِ کائنات کی جستجو کرے گا وہ مادیت، بے دینی اور الحاد تک پہنچے بغیر نہ رہ سکے گا۔ اس صدی میں جان ٹولینڈ (John Toland)، ڈیوڈ ہارٹلے (David Hartley)، جوزف پریسٹلے (Josephpristlay)، والٹیر (Valtaire)، لامیٹری (Lamettrie)، ہولباغ (Holbagh)، کیبانیس (Cabanis)، ڈینس رائیڈیرو (Denisdiderot)، مانٹسکیو (Montesquteu)، روسو (Rousseau) اور ایسے ہی دوسرے آزاد خیال فلاسفر و حکماء پیدا ہوئے جنھوں نے یا تو علانیہ خدا کے وجود سے انکار کیا یا اگر بعض نے اسے تسلیم کیا بھی تو اس کی حیثیت ایک دستوری فرماں روا (Constitutional Monarch) سے زیادہ نہ سمجھی، جو نظامِ کائنات کو ایک مرتبہ حرکت میں لے آنے کے بعد گوشہ نشین ہوگیا ہے اور اب اس نظام کے چلانے میں اس کا کوئی حصہ نہیں ہے۔ یہ لوگ عام طبیعت اور دنیائے مادّہ وحرکت کے باہر کسی چیز کے وجود کو ماننے کے لیے تیار نہ تھے اور ان کے نزدیک حقیقت صرف انھی چیزوں کی تھی جو ہمارے مشاہدے اور تجربے میں آتی ہیں۔ ہیوم (Hume) نے اپنی تجربیت (Empirieism) اور فلسفۂ تشکیک (Scepticise) سے اس طریقِ فکر کی زبردست تائید کی۔ اور معقولات کی صحت کے لیے بھی تجربے ہی کو معیار قرار دینے پر زور دیا۔ برکلے (Berkeley) نے مادیّت کی اس بڑھتی ہوئی رو کا جان توڑ مقابلہ کیا۔ مگر وہ اس کو نہ روک سکا۔ ہیگل (Hegal) نے مادیّت کے مقابلے میں تصوّرات (Idealism) کو فروغ دینا چاہا، مگر ٹھوس مادّے کے مقابلے میں لطیف تصوّر کی پرسش نہ ہوئی۔ کانٹ (Kant) نے

بیچ کی راہ نکالی کہ خدا کی ہستی، روح کا بقا اور ارادے کی آزادی ان چیزوں میں سے نہیں ہے جو ہمارے علم میں آسکیں۔ یہ چیزیں جانی نہیں جاسکتیں۔ تاہم ان پر ایمان لایا جاسکتا ہے اور حکمتِ عملی (Practisalivisdom) اس کی مقتضی ہے کہ ان پر ایمان لایا جائے۔ یہ خدا پرستی اور نیچریت کے درمیان مصالحت کی آخری کوشش تھی لیکن ناکام ہوئی۔ کیوں کہ جب عقل وفکر کی گم راہی نے خدا کو محض وہم کی پیداوار یا حد سے حد ایک معطل بے اختیار ہستی قرار دے دیا تو محض اخلاق کی حفاظت کے لیے اس کو ماننا، اس سے ڈرنا اور اس کی خوش نودی چاہنا، سراسر ایک غیر عاقلانہ فعل تھا۔

انیسویں صدی میں مادّیت اپنے کمال کو پہنچ گئی۔ فوگت (Faggt)، بوخز (Bucirick)، سولبے (Czulde)، کومت (Comtn)، مولشات (Moleschotte) اور دوسرے حکماء اور فلاسفہ نے مادّہ اور اس کے خواص کے سوا ہر شے کے وجود کو باطل قرار دیا۔ مل (Mill) نے فلسفے میں تجربیت اور اخلاق میں افادیّت (Utilitarianism) کو فروغ دیا۔ اسپنسر (Spencer) نے فلسفیانہ ارتقائیت اور نظامِ کائنات کے خود بہ خود پیدا ہونے اور زندگی کے آپ سے آپ رونما ہوجانے کا نظریہ پوری قوت کے ساتھ پیش کیا۔ حیاتیات (Biology)، عضویات (Physiology)، ارضیات (Geology) اور حیوانیات (Zoology) کے اکتشافات، عملی سائنس کی ترقی اور مادّی وسائل کی کثرت نے یہ خیال پوری پختگی کے ساتھ دلوں میں راسخ کردیا کہ کائنات آپ سے آپ وجود میں آئی ہے، کسی نے اس کو پیدا نہیں کیا۔ آپ سے آپ لگے بندھے قوانین کے تحت چل رہی ہے، کوئی اس کو چلانے والا اور ان قوانین کا نافذ کرنے والا نہیں ہے، آپ سے آپ ترقی کے منازل طے کرتی رہی ہے۔ کسی فوق الطبیعت ہستی کا ہاتھ اس خود بہ خود حرکت کرنے والی مشین میں کام نہیں کررہا ہے۔ بے جان مادّے میں جان کسی کے امر سے نہیں پڑتی، بلکہ خود مادّہ جب اپنے نظم میں ترقی کرتا ہے تو اس میں جان پڑ جاتی ہے۔ نمو، حرکت ارادی، احساس، شعور، فکر سب اسی ترقی یافتہ مادّے کے خواص ہیں۔ حیوان اور انسان سب کے سب مشینیں ہیں جو طبعی قوانین کے تحت چل رہی ہیں۔ ان مشینوں کے پرزے جس طور سے تربیت پاتے ہیں اسی طور کے افعال ان سے صادر ہوتے ہیں۔ ان میں کوئی اختیار، کوئی آزادارادہ (Freewill) نہیں ہے۔ ان کے نظام کا درہم برہم ہوجانا، ان کی انرجی کا خرچ ہوجانا ہی ان کی موت ہے۔ جو فنائے محض کی

ہم معنیٰ ہے۔ جب مشین ٹوٹ پھوٹ گئی تو اس کے خواص بھی باطل ہو گئے۔ اب ان کے لیے حشر اور بار دیگر پیدا ہونے کا کوئی امکان نہیں۔

ڈارون کے نظریۂ ارتقاء نے اس نیچریت اور مادیّت کو استحکام بخشنے اور ایک مدلّل اور منظّم علمی نظریے کی حیثیت دینے میں سب سے بڑھ کر حصہ لیا۔ اس کی کتاب اصل الانواع (Origin of Species) جو ۱۸۵۹ میں پہلی مرتبہ شائع ہوئی سائنس کی دنیا میں ایک انقلاب برپا کرنے والی کتاب سمجھی جاتی ہے۔ اس نے ایک ایسے طریقِ استدلال سے جو انیسویں صدی کے سائنٹفک دماغوں کے نزدیک استدلال کا محکم ترین طریقہ تھا۔ اس نظریے پر مہر تصدیق ثبت کر دی کہ کائنات کا کاروبار خدا کے بغیر چل سکتا ہے۔ آثار و مظاہرِ فطرت کے لیے خود فطرت کے قوانین کے سوا کسی اور علت کی حاجت نہیں۔ زندگی کے ادنیٰ مراتب سے لے کر اعلیٰ مراتب تک موجودات کا ارتقاء ایک ایسی فطرت کے تدریجی عمل کا نتیجہ ہے جو عقل و حکمت کے جواہر سے عاری ہے، انسان اور دوسری انواعِ حیوانی کو پیدا کرنے والا کوئی صانع حکیم نہیں ہے، بلکہ وہی ایک جان دار مشین جو کبھی کیڑے کی شکل میں رینگا کرتی تھی۔ تنازع للبقاء، بقائے اصلح، اور انتخاب طبیعی کے نتیجے کے طور پر ذی شعور اور ناطق انسان کی شکل میں نمودار ہو گئی۔

یہی وہ فلسفہ اور سائنس ہے جس نے مغربی تہذیب کو پیدا کیا ہے اس میں نہ کسی علیم و قدیر خدا کے خوف کی گنجائش ہے، نہ نبوت اور وحی والہام کی ہدایت کا کوئی وزن، نہ موت کے بعد کسی دوسری زندگی کا تصوّر، نہ حیاتِ دنیا کے حساب و کتاب کا کوئی کھٹکا۔ نہ انسان کی ذاتی ذمے داری کا کوئی سوال، نہ زندگی کے حیوانی مقاصد سے بالاتر کسی مقصد اور کسی نصب العین کا کوئی امکان، یہ خالص مادّی تہذیب ہے۔ اس کا پورا نظام خدا ترسی، راست روی، صداقت پسندی، حق جوئی، حسنِ اخلاق، دیانت، امانت، نیکی، حیا، پرہیز گاری اور پاکیزگی کے ان تصوّرات سے خالی ہے، جن پر اسلامی تہذیب کی بنیاد رکھی گئی ہے۔ اس کا نظریہ اسلام کے نظریے کی بالکل ضد ہے، اس کا راستہ اس راستے کی عین مخالف سمت میں ہے جو اسلام نے اختیار کیا ہے۔ اسلام جن چیزوں پر انسانی اخلاق اور تمدّن کی بنا رکھتا ہے ان کو یہ تہذیب بیخ و بن سے اکھاڑ دینا چاہتی ہے، اور یہ تہذیب جن بنیادوں پر انفرادی سیرت اور اجتماعی نظام کی عمارت قائم کرتی ہے ان پر اسلام کی عمارت ایک لمحے کے لیے بھی نہیں ٹھیر سکتی، گویا اسلام اور مغربی تہذیب دو ایسی

کشتیاں ہیں، جو بالکل مخالف سمتوں میں سفر کر رہی ہیں جو شخص ان میں سے کسی ایک کشتی پر سوار ہوگا اسے لامحالہ دوسری کشتی کو چھوڑنا پڑے گا، اور جو بیک وقت ان دونوں پر سوار ہوگا اس کے دو ٹکڑے ہو جائیں گے۔

اس کو بدقسمتی کے سوا اور کیا کہیے کہ جس صدی میں یہ نئی تہذیب اپنی مادّہ پرستی، الحاد اور دہریت کی انتہا کو پہنچی، ٹھیک وہی صدی تھی جس میں مراکش سے لے کر مشرق اقصیٰ تک تمام اسلامی ممالک مغربی قوموں کے سیاسی اقتدار اور حاکمانہ استیلاء سے مغلوب ہوئے۔ مسلمانوں پر مغربی تلوار اور قلم دونوں کا حملہ ایک ساتھ ہوا۔ جو دماغ مغربی طاقتوں کے سیاسی غلبے سے مرعوب اور دہشت زدہ ہو چکے تھے۔ ان کے لیے مشکل ہو گیا کہ مغرب کے فلسفہ و سائنس اور ان کی پروردہ تہذیب کے رعب وداب سے محفوظ رہتے۔ خصوصیت کے ساتھ ان مسلمان قوموں کی حالت اور بھی زیادہ نازک تھی جو بہ راہ راست کسی مغربی سلطنت کے زیرِ حکم آ گئی تھیں۔ ان کو اپنے دنیوی مفاد کی حفاظت کے لیے مجبوراً مغربی علوم حاصل کرنے پڑے اور چوں کہ یہ تحصیلِ علوم خالص علم کی خاطر نہ تھی اور مزید برآں ایک مرعوب ذہنیت کے ساتھ مغربی استادوں کے سامنے زانوئے ادب تہ کیا گیا تھا، اس لیے مسلمانوں کی کئی نسلوں نے شدّت کے ساتھ مغربی افکار اور سائنٹیفک نظریات کا اثر قبول کیا۔ ان کی ذہنیتیں مغربی سانچے میں ڈھلتی چلی گئیں۔ ان کے دلوں میں مغربی تہذیب کا تصوّر بڑھتا چلا گیا۔ ان میں وہ ناقدانہ نظر پیدا ہی نہیں ہوئی جس سے وہ صحیح اور غلط کو پرکھتے، اور صرف صحیح کو اختیار کرتے۔ ان میں یہ صلاحیت ہی نہ پیدا ہو سکی کہ آزادی اور استقلال کے ساتھ غور و فکر کرتے اور اپنے ذاتی اجتہاد سے کوئی رائے قائم کرتے۔ اسی کا نتیجہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ اسلامی تہذیب جن بنیادوں پر قائم ہے وہ متزلزل ہو گئی ہیں۔ ذہنیتوں کا وہ سانچہ بگڑ گیا ہے جس سے اسلامی طریق پر سوچا اور سمجھا جا سکتا تھا۔ مغربی طریق پر سوچنے اور مغربی تہذیب کے اصولوں پر اعتقاد رکھنے والے دماغوں کی ساخت ہی ایسی ہے کہ اس میں اسلام کے اصول ٹھیک نہیں بیٹھ سکتے، اور جب اصول ہی اس میں نہیں سما سکتے تو فروع میں طرح طرح کے شبہات اور نت نئے شکوک پیدا ہونا ہرگز قابلِ تعجب نہیں۔

اس میں شک نہیں کہ مسلمانوں کا سوادِ اعظم اب بھی اسلام کی صداقت پر ایمان رکھتا

ہے اور مسلمان رہنا چاہتا ہے۔ لیکن دماغ مغربی افکار اور مغربی تہذیب سے متاثر ہوکر اسلام سے منحرف ہو رہے ہیں، اور یہ انحراف بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ سیاسی غلبہ و استیلاء سے قطع نظر مغرب کا علمی اور فکری ادب و تسلط دنیا کی ذہنی فضا پر چھایا ہوا ہے اور اس نے نگاہوں کے زاویے اس طرح بدل دیے ہیں کہ دیکھنے والوں کے لیے مسلمان کی نظر سے دیکھنا اور سوچنے والوں کے لیے اسلامی طریق پر سوچنا مشکل ہوگیا ہے۔ یہ اشکال اس وقت تک دور نہ ہوگا جب تک مسلمانوں میں آزاد اہلِ فکر پیدا نہ ہوں گے۔ اسلام میں ایک نشاۃِ جدیدہ (Renaissance) کی ضرورت ہے۔ پرانے اسلامی مفکرین و محققین کا سرمایہ اب کام نہیں دے سکتا۔ دنیا اب بہت آگے بڑھ چکی ہے۔ اس کو اب الٹے پاؤں ان منازل کی طرف واپس لے جانا ممکن نہیں ہے، جن سے وہ چھ سو برس پہلے گزر چکی ہے۔ علم و عمل کے میدان میں رہنمائی وہی کرسکتا ہے جو دنیا کو آگے کی جانب چلائے نہ کہ پیچھے کی جانب۔ لہٰذا اب اگر اسلام دوبارہ دنیا کا رہنما بن سکتا ہے تو اس کی بس یہی صورت ہے کہ مسلمانوں میں ایسے مفکر اور محقق پیدا ہوں جو فکر و نظر اور تحقیق و اکتشاف کی قوت سے ان بنیادوں کو ڈھادیں، جن پر مغربی تہذیب کی عمارت قائم ہوتی ہے۔ قرآن کے بتائے ہوئے طریقِ فکر و نظر پر آثار کے مشاہدے اور حقائق کی جستجو سے ایک نئے نظام فلسفہ کی بنا رکھیں جو خالص اسلامی فکر کا نتیجہ ہو۔ ایک نئی حکمتِ طبیعی (Naturalscience) کی عمارت اٹھائیں جو قرآن کی ڈالی ہوئی داغ بیل پر اٹھے۔ ملحدانہ نظریے کو توڑ کر الٰہی نظریے پر فکر و تحقیق کی اساس قائم کریں اور اس جدید فکر و تحقیق کی عمارت کو اس قوت کے ساتھ اٹھائیں کہ وہ تمام دنیا پر چھا جائے اور دنیا میں مغرب کی مادّی تہذیب کے بہ جائے اسلام کی حقانی تہذیب جلوہ گر ہو۔

یہ جو کچھ کہا گیا ہے اس کے مقصد و مدّعا کو تمثیل کے پیرائے میں یوں سمجھیے کہ دنیا گویا ایک ریل گاڑی ہے جس کو فکر و تحقیق کا انجن چلا رہا ہے اور مفکرین و محققین اس انجن کے ڈرائیور ہیں۔ یہ گاڑی ہمیشہ اسی رُخ پر سفر کرتی ہے، جس رخ پر ڈرائیور اس کو چلاتے ہیں۔ جو لوگ اس میں بیٹھے ہیں وہ مجبور ہیں کہ اسی طرف جائیں جس طرف گاڑی جا رہی ہے۔ خواہ وہ اس طرف جانا چاہیں یا نہ چاہیں۔ اگر اس گاڑی میں کوئی ایسا مسافر بیٹھا ہے جو اس راہ پر نہیں جانا چاہتا تو اس سے زیادہ کچھ نہیں کرسکتا کہ چلتی ہوئی گاڑی ہی میں بیٹھے بیٹھے اپنی نشست کا رُخ آگے کے

بہ جائے پیچھے یا دائیں بائیں پھیر دے مگر نشست کا رُخ بدل دینے سے وہ اپنے سفر کا رُخ نہیں بدل سکتا۔ سفر کا رُخ بدلنے کی صورت اس کے سوا اور کوئی نہیں کہ انجن پر قبضہ کیا جائے اور اس کی رفتار کو اس جانب پھیر دیا جائے جو مطلوب ہے۔ اس وقت جو لوگ انجن پر قابض ہیں وہ سب خدا سے پھرے ہوئے ہیں اور فکرِ اسلامی سے بے بہرہ ہیں اس لیے گاڑی اپنے مسافروں کو لیے ہوئے الحاد اور مادّہ پرستی کی طرف دوڑی چلی جا رہی ہے اور سب مسافر طوعاً و کرہاً اسلام کی منزلِ مقصود سے دور اور دور تر ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ اب اس رفتار کو بدلنے کے لیے ضرورت ہے کہ خدا پرستوں میں سے کچھ باہمت مرد اُٹھیں، اور جد و جہد کر کے انجن کو ان ملحدین کے ہاتھوں سے چھین لیں، جب تک یہ نہ ہو گا گاڑی کا رُخ نہ بدلے گا۔ اور وہ ہمارے جھنجھلانے، بگڑنے اور شور مچانے کے باوجود اسی راہ پر سفر کرتی رہے گی، جس پر ناخدا شناس ڈرائیور اس کو چلا رہے ہیں۔

(ترجمان القرآن، جمادی الآخرہ ۱۳۵۳ھ ستمبر ۱۹۳۴ء)

ہندستان میں اسلامی تہذیب کا انحطاط

دنیائے اسلام کا بیشتر حصہ ان ممالک پر مشتمل ہے جو صدر اوّل کے مجاہدین کی کوششوں سے فتح ہوئے ہیں ان کو جن لوگوں نے فتح کیا تھا وہ ملک گیری اور حصول غنائم کے لیے نہیں بلکہ خدا کے کلمے کو دنیا میں بلند کرنے کے لیے سروں سے کفن باندھ کر نکلے تھے۔ وہ طلبِ دنیا کے بہ جائے طلبِ آخرت کے نشے میں سرشار تھے۔ اس لیے انھوں نے اپنے مفتوحین کو مطیع و باج گزار بنانے پر اکتفا نہ کیا بلکہ انھیں اسلام کے رنگ میں رنگ دیا۔ ان کی پوری آبادی یا ان کے سوادِ اعظم کو ملّتِ حنیفی میں جذب کرلیا۔ علم و عمل کی قوت سے ان میں اسلامی فکر اور اسلامی تہذیب کو اتنا راسخ کردیا کہ وہ خود تہذیبِ اسلامی کے علم بردار اور علوم اسلامی کے معلّم بن گئے۔ ان کے بعد وہ ممالک ہیں جو اگرچہ صدرِ اوّل کے بعد اس عہد میں فتح ہوئے جب کہ اسلامی جوش سرد ہوچکا تھا اور فاتحین کے دلوں میں خالص جہاد فی سبیل اللہ کی روح سے زیادہ ملک گیری کی ہوس نے جگہ لے لی تھی، لیکن اس کے باوجود اسلام وہاں پھیلنے اور جڑ پکڑنے میں کام یاب ہوگیا اور اس نے ان ممالک میں کلیتہً ایک قومی مذہب اور قومی تہذیب کی حیثیت حاصل کرلی۔

بدقسمتی سے ہندستان کا معاملہ ان دونوں قسم کے ممالک سے مختلف ہے۔ صدرِ اوّل میں اس ملک کا بہت تھوڑا سا حصہ فتح ہوا تھا اور اس تھوڑے سے حصے پر بھی جو کچھ اسلامی تعلیم و تہذیب کے اثرات پڑے تھے ان کو باطنیت کے سیلاب نے ملیا میٹ کردیا۔ اس کے بعد جب ہندستان میں مسلمانوں کی فتوحات کا اصلی سلسلہ شروع ہوا تو فاتحوں میں صدرِ اوّل کے سے مسلمانوں کی خصوصیات باقی نہیں رہی تھیں۔ انھوں نے یہاں اشاعتِ اسلام کے بہ جائے توسیع مملکت میں اپنی قوتیں صرف کیں۔ اور لوگوں سے اطاعتِ خدا اور رسولؐ کے بہ جائے اپنی اطاعت و باج گزاری

کا مطالبہ کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ صدیوں کی فرماں روائی کے بعد بھی ہندستان کا سوادِ اعظم غیر مسلم رہا۔ یہاں اسلامی تہذیب جڑ نہ پکڑ سکی، یہاں کے باشندوں میں جنھوں نے اسلام قبول کیا ان کی اسلامی تعلیم و تربیت کا بھی کوئی خاص انتظام نہ کیا گیا۔ نو مسلم جماعتوں میں قدیم ہندوانہ خیالات اور رسم و رواج کم و بیش باقی رہے اور خود باہر کے آئے ہوئے قدیم الاسلام مسلمان بھی اہلِ ہند کے میل جول سے مشرکانہ طریقوں کے ساتھ رواداری برتنے اور بہت سی جاہلانہ رسوم کا اتباع کرنے لگے۔

اسلامی ہند کی تاریخ اور اس کے موجودہ حالات کا مطالعہ کرنے سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ جس زمانے میں اس ملک پر مسلمانوں کا سیاسی اقتدار پوری قوت سے چھایا ہوا تھا۔ اس زمانے میں یہاں اسلام کے اثرات کم زور تھے اور یہاں کا ماحول خالص اسلامی ماحول نہ تھا۔ اگرچہ ہندوؤں کا مذہب اور تمدّن بالذّات ضعیف تھا۔ اور محکوم و مغلوب قوم کا مذہب و تمدّن ہونے کی حیثیت سے اور بھی زیادہ ضعیف ہوگیا تھا۔ لیکن پھر بھی مسلمان حکمرانوں کی ’’رواداری‘‘ اور غفلت کی بہ دولت وہ ملک کے سوادِ اعظم پر چھایا ہوا رہا اور ہندستان کی فضا پر اس کے مستولی ہونے اور خود مسلمانوں کی اسلامی تعلیم و تربیت مکمل نہ ہونے کی وجہ سے یہاں کے مسلمانوں کا ایک بڑا حصہ اپنے عقائد اور اپنی تہذیب میں کبھی اتنا صحیح اور پختہ اور کامل مسلمان نہ ہوسکا جتنا وہ خالص اسلامی ماحول میں ہوسکتا تھا۔

اٹھارہویں صدی عیسوی میں وہ سیاسی اقتدار بھی مسلمانوں سے چھن گیا جو ہندستان میں اسلامی تہذیب کا سب سے بڑا سہارا تھا۔ پہلے مسلمانوں کی سلطنت متفرق ہوکر چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم ہوئی۔ پھر مرہٹوں، سکھوں اور انگریزوں کے سیلاب نے ایک ایک کرکے ان ریاستوں میں سے بیشتر کا خاتمہ کردیا۔ اس کے بعد قضاء الٰہی نے انگریزوں کے حق میں اس ملک کی حکومت کا فیصلہ صادر کیا اور ایک صدی سے زیادہ زمانہ گزرا تھا کہ مسلمان اس سرزمین میں مغلوب و محکوم ہوگئے، جس پر انھوں نے صدیوں حکومت کی تھی۔ انگریزی سلطنت جتنی جتنی پھیلتی گئی مسلمانوں سے ان طاقتوں کو چھینتی چلی گئی جن کے بل پر ہندستان میں اسلامی تہذیب کسی حد تک قائم تھی، اس نے فارسی اور عربی کے بہ جائے انگریزی کو ذریعہ تعلیم بنایا، اسلامی قوانین کو منسوخ کیا، شرعی عدالتیں توڑ دیں، دیوانی اور فوج داری معاملات میں خود اپنے قوانین جاری

کیے، اسلامی قانون کے نفاذ کو خود مسلمانوں کے حق میں صرف نکاح و طلاق وغیرہ تک محدود کر دیا۔ اور اس محدود نفاذ کے اختیارات بھی مسلمان قاضیوں کے بہ جائے عام دیوانی عدالتوں کے سپرد کر دیے جن کے حکّام عموماً غیر مسلم ہوتے ہیں اور جن کے ہاتھوں ''محمڈن لا'' روز بہ روز مسخ ہوتا چلا جا رہا ہے۔ اس پر مزید یہ کہ ابتدا سے انگریزی حکومت کی یہ پالیسی رہی کہ مسلمانوں کو معاشی حیثیت سے پامال کر کے ان کے اس قومی فخر و ناز کو کچل ڈالے جو ایک حاکم قوم کی حیثیت سے صدیوں تک ان کے دلوں میں پرورش پاتا رہا ہے۔ چناں چہ ایک صدی کے اندر اندر اس پالیسی کی بہ دولت اس قوم کو مفلس، جاہل، پست خیال، فاسد الاخلاق اور ذلیل و خوار کر کے چھوڑا گیا۔

اس گرتی ہوئی قوم پر آخری ضرب وہ تھی جو ١٨٥٧ کے ہنگامے میں لگی، اس نے مسلمانوں کی صرف سیاسی قوت ہی کا خاتمہ نہیں کیا بلکہ ان کی ہمتوں کو توڑ دیا۔ ان کے دلوں پر مایوسی اور احساسِ ذلّت کی تاریک گھٹائیں مسلط کر دیں ان کو انگریزی اقتدار سے اتنا مرعوب کیا کہ ان میں قومی خودداری کا شائبہ تک باقی نہ رہا اور ذلت و خواری کی انتہائی گہرائیوں میں پہنچ کر وہ ایسا سمجھنے پر مجبور ہو گئے کہ دنیا میں سلامتی حاصل کرنے کا ذریعہ انگریز کی تقلید کے سوا اور کوئی نہیں ہے، اور ان کا اپنا سرمایۂ علم و تہذیب جو کچھ بھی ہے، ذلیل، سببِ ذلت اور موجبِ نکبت ہے۔

انیسویں صدی کے نصفِ دوم میں جب مسلمانوں نے سنبھل کر پھر اُٹھنے کی کوشش کی تو وہ دو قسم کی کم زوریوں میں مبتلا تھے۔

ایک یہ کہ وہ فکر و عمل کے اعتبار سے پہلے ہی اسلامی عقائد اور تہذیب میں پختہ نہ تھے اور ایک غیر اسلامی ماحول اپنے جاہلی افکار اور تمدّن کے ساتھ ان کو گھیرے ہوئے تھا۔

دوسرے یہ کہ غلامی اپنے معائب کے ساتھ نہ صرف ان کے جسم پر بلکہ ان کے قلب و روح پر بھی مسلط ہو چکی تھی اور وہ ان تمام قوتوں سے محروم کر دیے گئے تھے، جن سے کوئی قوم اپنے تمدّن و تہذیب کو برقرار رکھ سکتی ہے۔

اس دوہری کم زوری کی حالت میں مسلمانوں نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو انھیں نظر آیا کہ انگریزی سلطنت نے اپنی ہوشیاری سے معاشی ترقی کے تمام دروازے بند کر دیے ہیں اور ان کی کنجی انگریزی مدرسوں اور کالجوں میں رکھ دی ہے۔ اب مسلمانوں کے لیے اس کے سوا

کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ انگریزی تعلیم حاصل کریں۔ چناں چہ مرحوم سرسید احمد خاں کی رہ نمائی میں ایک زبردست تحریک اُٹھی، جس کے اثر سے تمام ہندستان کے مسلمانوں میں انگریزی تعلیم کی ضرورت کا احساس پیدا ہوگیا۔ پرانے لوگوں کی مخالفت بے کار ثابت ہوئی۔ دولت، عزّت اور اثر کے لحاظ سے قوم کی اصلی طاقت جن لوگوں کے ہاتھ میں تھی، انھوں نے اس نئی تحریک کا ساتھ دیا، ہندستان کے مسلمان تیزی کے ساتھ انگریزی تعلیم کی طرف بڑھے۔ قوم کا تلچھٹ پرانے مذہبی مدرسوں کے لیے چھوڑ دیا گیا تا کہ مسجدوں کی امامت اور مکتبوں کی معلّمی کے کام آئے اور خوش حال طبقوں کے بہترین نونہال انگریزی مدرسوں اور کالجوں میں بھیج دیے گئے تا کہ ان کے دل ودماغ کے سادہ اوراق پر فرنگی علوم وفنون کے نقوش ثبت کیے جائیں۔

یہ انیسویں صدی کے آخری چوتھائی کا زمانہ تھا۔ یورپ میں اس وقت مادیّت انتہائی عروج پر تھی۔ اٹھارہویں صدی میں سائنس پوری طرح مذہب کو شکست دے چکا تھا۔ جدید فلسفہ اور نئے علومِ حکمت کی رہ نمائی میں سیاسیات، معاشیات، اخلاقیات، اور اجتماعیات کے پرانے نظریے باطل ہوکر نئے نظریے قائم ہو چکے تھے۔ یورپ میں ایک خاص تہذیب پیدا ہو چکی تھی، جس کی بنیاد کلیتہً ان ہی جدید نظریوں پر قائم تھی۔ اس انقلابِ عظیم نے زندگی کے عملی معاملات سے تو مذہب اور ان اصولوں کو جو مذہبی رہ نمائی پر مبنی تھے کلّی طور پر خارج کر ہی دیا تھا البتہ تخیّل کی دنیا میں مذہبی اعتقاد کی تھوڑی سی جگہ باقی رہ گئی تھی۔ سو اب اس کے خلاف زبردست جنگ جاری تھی۔ اگرچہ علومِ حکمت میں سے کسی علم نے بھی کائنات کے الٰہی نظریے کے خلاف کوئی ثبوت (جس کو "ثبوت" کہا جاسکتا ہو) بہم نہیں پہنچایا تھا۔ مگر اہلِ حکمت بغیر کسی دلیل کے محض اپنے رجحانِ طبیعت کی بنا پر خدا سے بے زار اور الٰہی نظریے کے دشمن تھے اور چوں کہ انھی کو اس وقت دنیا کی عقلی وعملی امامت کا منصب حاصل تھا اس لیے ان کے اثرات سے خدا سے بے زاری (Theophobta) کا مرض ایک عام وبا کی طرح پھیل گیا۔ وجودِ باری کا انکار، کائنات کو آپ سے آپ پیدا ہونے والی اور آپ سے آپ قوانین طبعی کے تحت چلنے والی چیز سمجھنا، خدا پرستی کو توہم (Superstition) قرار دینا، مذہب کو لغو اور مذہبیت کو تنگ نظری و تنگ خیالی کہنا اور نیچریت (Naturalism) کو روشن خیالی کا ہم معنیٰ سمجھنا اس وقت فیشن میں داخل ہو چکا تھا۔ ہر شخص خواہ وہ فلسفہ وسائنس میں کچھ بھی دست گاہ نہ رکھتا ہو اور اس نے خود ان مسائل کی تحقیق میں ذرّہ برابر بھی

کوشش نہ کی ہو۔ صرف اس بنا پر ان خیالات کا اظہار کرتا تھا کہ سوسائٹی میں وہ ایک روشن خیال آدمی سمجھا جائے، روحانیت (Spritualism) یا فوق الطبیعت (Super Naturalism) کی تائید میں کچھ کہنا اس وقت کفر کا درجہ رکھتا تھا۔ اگر کوئی بڑے سے بڑا سائنس داں بھی اس قسم کے کسی خیال کا اظہار کرتا تو سائنٹیفک حلقوں میں اس کی ساری وقعت جاتی رہتی، اس کے تمام کارناموں پر پانی پھر جاتا اور وہ اس قابل نہ رہتا کہ اسے کسی علمی جماعت کی رکنیت کا شرف بخشا جائے۔

۱۸۵۹ میں ڈارون کی کتاب اصل الانواع (Origin of Species) شائع ہوئی جس نے نیچریت اور دہریت کی آگ پر تیل کا کام کیا۔ اگرچہ ڈارون کے دلائل جو اس نے اپنے مخصوص نظریۂ ارتقاء کی تائید میں پیش کیے تھے کم زور اور محتاج ثبوت تھے۔ اس کے سلسلۂ ارتقاء میں ایک کڑی نہیں بلکہ ہر موجود کڑی کے آگے اور پیچھے بہت سی کڑیاں مفقود تھیں۔ اہلِ حکمت اس وقت بھی اس نظریے سے مطمئن نہ تھے۔ حتیٰ کہ خود اس کا سب سے بڑا وکیل ہکسلے (Huxley) بھی اس پر ایمان نہ لایا تھا۔ مگر اس کے باوجود محض خدا سے بے زاری کی بنا پر ڈارونیت کو قبول کرلیا گیا۔ اس کی حد سے زیادہ تشہیر کی گئی۔ اور مذہب کے خلاف ایک زبردست آلے کے طور پر استعمال کیا گیا۔ کیوں کہ اس نظریے نے اہلِ حکمت کے زعمِ باطل میں اس دعوے کا ثبوت فراہم کیا تھا۔ (حالاں کہ دراصل ایک دعویٰ کیا تھا جو محتاجِ ثبوت تھا) کہ کائنات کا نظام کسی فوق الطبیعی قوّت کے بغیر خود بہ خود طبیعی قوانین کے تحت چل رہا ہے۔ اہلِ مذہب نے اس نظریے کی مخالفت کی، اور برٹش ایسوسی ایشن کے جلسے میں بشپ آف آکسفورڈ اور گلیڈ اسٹون نے اپنی خطابت کا پورا زور اس کے خلاف صرف کیا۔ مگر شکست کھائی اور آخر کار اہلِ مذہب سائنٹیفک دہریت سے اس قدر مرعوب ہوئے کہ ۱۸۸۲ میں جب ڈارون نے وفات پائی تو چرچ آف انگلینڈ نے سب سے بڑا اعزاز اس کو بخشا جو اس کے اختیار میں تھا۔ یعنی اسے ویسٹ منسٹر ابیی میں دفن کرنے کی اجازت دی۔ حالاں کہ وہ یورپ میں مذہب کی قبر کھودنے والوں کا سرخیل تھا۔ اور اس نے افکار کو الحاد، زندقہ اور بے دینی کی طرف چلانے اور وہ ذہنیت پیدا کرنے میں سب سے زیادہ حصہ لیا تھا، جس نے آخر کار بالشوزم اور فاشزم کو پھلنے پھولنے اور بار آور ہونے کا موقع دیا۔

یہ زمانہ تھا جب ہماری قوم کے نوجوان انگریزی تعلیم اور فرنگی تہذیب سے استفادہ کرنے کے لیے مدرسوں اور کالجوں میں بھیجے گئے۔ اسلامی تعلیم سے کورے، اسلامی تہذیب میں

خام، انگریزی حکومت سے مرعوب، فرنگی تہذیب کی شان وشوکت پر فریفتہ پہلے ہی سے تھے۔ اب جوانھوں نے انگریزی مدرسے کی فضا میں قدم رکھا تو اس کا پہلا اثر یہ ہوا کہ ان کی ذہنیت کا سانچہ بدلا اور ان کی طبیعت کا رُخ مذہب سے پھر گیا۔ کیوں کہ اس آب وہوا کی اوّلین تاثیر یہ تھی کہ یورپ کے کسی مصنّف یا محقق کے نام سے جو چیز پیش کی جائے اس پر وہ بے تامّل اٰمنّا وَ صَدَّقْنا کہیں اور قرآن وحدیث یا ائمۂ دین کی طرف سے کوئی بات پیش ہو تو اس پر دلیل کا مطالبہ کریں۔ اس منقلب ذہنیت کے ساتھ انھوں نے جن مغربی علوم کی تعلیم حاصل کی ان کے اصول وفروع اکثر وبیشتر اسلام کے اصول اور جزئیات احکام کے خلاف تھے۔ اسلام میں مذہب کا تصوّر یہ ہے کہ وہ زندگی کا قانون ہے اور مغرب میں مذہب کا تصوّر یہ ہے کہ وہ محض ایک شخصی اعتقاد ہے، جس کا عملی زندگی سے کوئی تعلق نہیں۔ اسلام میں پہلی چیز ایمان باللہ ہے اور وہاں سرے سے اللہ کا وجود ہی مسلم نہیں۔ اسلام کا پورا نظامِ تہذیب وحی ورسالت کے اعتقاد پر قائم ہے اور وہاں وحی کی حقیقت ہی میں شک اور رسالت کے منجانب اللہ ہونے ہی میں شبہ ہے۔ اسلام میں آخرت کا اعتقاد پورے نظامِ اخلاق کا سنگِ بنیاد ہے اور وہاں یہ بنیاد خود بے بنیاد نظر آتی ہے۔ اسلام میں جو عبادات اور اعمال فرض ہیں وہاں محض عہدِ جاہلیت کے رسوم ہیں، جن کا اب کوئی عملی فائدہ نہیں۔ اسی طرح اسلام کے اصولِ تمدّن وتہذیب بھی مغربی تہذیب وتمدّن کے اصول سے یکسر مختلف ہیں۔ قانون میں اسلام کا اصل الاصول یہ ہے کہ خدا خود واضع قانون ہے، رسولِ خدا شارحِ قانون اور انسان صرف متبع قانون۔ مگر وہاں خدا کو وضع قانون کا سرے سے کوئی حق ہی نہیں۔ لیجسلیچر واضع قانون ہے اور قوم لیجسلیچر کو منتخب کرنے والی ہے۔ سیاسیات میں اسلام کا مطمحِ نظر حکومتِ الٰہی ہے اور مغرب کا مطمحِ نظر حکومتِ قومی۔ اسلام کا رُخ بین الاقوامیت (Internationalism) کی طرف ہے اور مغرب کا کعبۂ مقصود قومیت (Nationalism)، معاشیات میں اسلام اکلِ حلال اور زکوٰۃ وصدقہ اور تحریم سود پر زور دیتا ہے اور مغرب کا سارا نظامِ معاشی ہی سود اور منافع پر چل رہا ہے۔ اخلاقیات میں اسلام کے پیشِ نظر آخرت کی کام یابی ہے اور مغرب کے پیشِ نظر دنیا کا فائدہ، اجتماعی مسائل میں بھی اسلام کا راستہ قریب قریب ہر معاملہ میں مغرب کے راستے سے مختلف ہے۔ ستر وحجاب، حدودِ زن ومرد، تعدّدِ ازدواج، قوانینِ نکاح و طلاق، ضبط ولادت، حقوقِ ذوی الارحام، حقوقِ زوجین اور ایسے ہی دوسرے بہت سے معاملات

ہیں جن میں ان دونوں کا اختلاف اتنا نمایاں ہے کہ بیان کی حاجت نہیں۔ اور اس اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ دونوں کے اصول مختلف ہیں۔ ہمارے نوجوانوں نے مرعوب بلکہ غلامانہ ذہنیت اور پھر غیر مکمل اسلامی تعلیم و تربیت کے ساتھ جب ان مغربی علوم کی تحصیل کی اور مغربی تہذیب کے زیرِ اثر تربیت پائی تو نتیجہ جو کچھ ہونا چاہیے تھا وہی ہوا۔ ان میں تنقید کی صلاحیت پیدا نہ ہوسکی۔ انھوں نے مغرب سے جو کچھ سیکھا اس کو صحت اور درستی کا معیار سمجھ لیا۔ پھر ناقص علم کے ساتھ اسلام کے اصول وقوانین کو اس معیار پر جانچ کر دیکھا اور جس مسئلہ میں دونوں کے درمیان اختلاف پایا اس میں کبھی مغرب کی غلطی محسوس نہ کی بلکہ اسلام ہی کو برسرِ غلط سمجھا اور اس کے اصول وقوانین میں ترمیم و تنسیخ کرنے پر آمادہ ہوگئے۔

جدید تعلیم نے معاشی اور سیاسی حیثیت سے ہندستان کے مسلمانوں کو خواہ کتنا ہی فائدہ پہنچایا ہو مگر ان کے مذہب اور ان کی تہذیب کو جو نقصان پہنچایا ہے اس کی تلافی کسی فائدے سے نہیں ہوسکتی۔ (ترجمان القرآن۔ رجب ۱۳۵۳ھ اکتوبر ۱۹۳۴ء)

مرض اور اس کا علاج

اسلام محض ایک عقیدہ نہیں ہے، نہ وہ محض چند "مذہبی" اعمال اور رسموں کا مجموعہ ہے۔ بلکہ وہ انسان کی پوری زندگی کے لیے ایک مفصل اسکیم ہے۔ اس میں عقائد، عبادات اور عملی زندگی کے اصول وقواعد الگ الگ چیزیں نہیں ہیں بلکہ سب مل کر ایک ناقابلِ تقسیم مجموعہ بناتے ہیں۔ جس کے اجزاء کا باہمی ربط بالکل ویسا ہی ہے جیسا کہ ایک زندہ جسم کے اعضاء میں ہوتا ہے۔

آپ کسی زندہ آدمی کے ہاتھ اور پاؤں کاٹ دیں۔ آنکھیں اور کان اور زبان جدا کردیں، معدہ اور جگر نکال لیں، پھیپھڑے اور گردے الگ کردیں اور دماغ بھی پورا یا کچھ کم و بیش کاسۂ سر سے خارج کردیں اور بس ایک دل اس کے سینے میں رہنے دیں، کیا یہ باقی ماندہ حصۂ جسم زندہ رہ سکے گا؟ اگر زندہ بھی رہے تو کیا وہ کسی کام کا ہوگا؟

ایسا ہی حال اسلام کا بھی ہے۔ عقائد اس کا قلب ہیں۔ وہ طریقِ فکر (Attitude of mind)، نظریۂ حیات (View of Life)، مقصدِ زندگی اور معیارِ قدر (Standard of values) جو ان عقائد سے پیدا ہوتا ہے اس کا دماغ ہے۔ عبادت اس کے جوارح اور قوائم ہیں، جن کے بل پر وہ کھڑا ہوتا ہے اور کام کرتا ہے۔ معیشت، معاشرت، سیاست اور نظمِ اجتماعی کے تمام وہ اصول جو زندگی کے لیے اسلام نے پیش کیے ہیں، وہ اس کے لیے معدے، جگر اور دوسرے اعضائے رئیسہ کا حکم رکھتے ہیں۔ اس کو صحیح وسالم آنکھوں اور بے عیب کانوں کی ضرورت ہے تاکہ وہ زمانے کے احوال وظروف کی ٹھیک ٹھیک رپورٹیں دماغ تک پہنچائیں اور دماغ ان کے متعلق صحیح حکم لگائے۔ اس کو اپنے قابو کی زبان درکار ہے تاکہ وہ اپنی خودی کا کماحقہٗ اظہار کرے۔ اس کو پاک وصاف فضا کی حاجت ہے، جس سے وہ سانس لے سکے۔ اس کو طیّب وطاہر غذا مطلوب ہے، جو اس کے معدے سے مناسبت رکھتی ہو اور اچھا خون بنا سکے۔

اس پورے نظام میں اگرچہ قلب (یعنی عقیدہ) بہت اہمیت رکھتا ہے۔ مگر اس کی اہمیت اسی لیے تو ہے کہ وہ تمام اعضاء و جوارح کو زندگی کی طاقت بخشتا ہے۔ جب اکثر و بیشتر اعضاء کٹ جائیں، جسم سے خارج کردیے جائیں یا خراب ہوجائیں تو اکیلا قلب تھوڑے بہت بچے کھچے خستہ و بیمار اعضاء کے ساتھ کیسے زندہ رہ سکتا ہے؟ اور اگر زندہ بھی رہے تو اس زندگی کی کیا وقعت ہوسکتی ہے؟

اب آپ غور فرمائیں کہ اس وقت آپ اپنی اسی ہندستان کی دنیا میں اسلام کو کس حال میں دیکھ رہے ہیں۔ قوانین اسلامی قریب قریب معطل ہیں۔ اخلاق میں، معاشرت میں، معیشت میں اور زندگی کے سارے معاملات میں اصولِ اسلامی کا نفاذ پانچ فی صدی سے زیادہ نہیں ہے۔ غیر اسلامی ماحول، غیر اسلامی تربیت اور غیر اسلامی تعلیم نے دماغ کو کہیں بالکل اور کہیں کچھ کم و بیش غیر مسلم بنا دیا ہے۔ آنکھیں دیکھتی ہیں مگر زاویہ نظر بدل گیا ہے، کان سنتے ہیں مگر ان کے پردے متغیر ہوچکے ہیں، زبان بولتی ہے مگر اس کی گویائی میں فرق آگیا ہے۔ پھیپھڑوں کو صاف ہوا میسّر نہیں کہ ایک زہریلی فضا چاروں طرف محیط ہے، معدے کو پاک غذا نہیں ملتی کہ رزق کے خزانے مسموم ہوچکے، عبادات جو اس جسم کے جوارح اور قوایم ہیں قریب قریب ساٹھ فی صدی تو مفلوج ہیں اور چالیس فی صدی جو باقی ہیں وہ بھی کوئی اثر نہیں دکھا رہے ہیں۔ کیوں کہ دوسرے اعضائے رئیسہ سے ان کا تعلق باقی نہیں رہا۔ اسی لیے فالج کا مادّہ ان میں پھیلتا جا رہا ہے۔ ایسی حالت میں کیا آپ کہہ سکتے ہیں کہ یہ پورا اسلام ہے جو آپ کے سامنے ہے؟ کتنے ہی اعضاء کٹ گئے، کتنے مفلوج ہوگئے، کتنے موجود ہیں، مگر بیمار ہیں اور ٹھیک کام ہی نہیں کر رہے ہیں۔ ان کے ساتھ ایک قلب باقی ہے اور وہ خود بیمار ہو رہا ہے کیوں کہ جس طرح وہ ان اعضاء کو زندگی کی طاقت بخشتا تھا اسی طرح خود بھی تو ان سے طاقت حاصل کرتا تھا۔ جب دماغ اور پھیپھڑے اور معدہ و جگر سب کا فعل خراب ہوگیا تو قلب کیسے صحیح و سالم رہ سکتا ہے؟ یہ محض اس زبردست قلب کی غیر معمولی طاقت ہے کہ نہ صرف خود زندہ ہے بلکہ بچے کھچے اعضاء کو بھی کسی نہ کسی طرح چلائے جا رہا ہے۔ مگر کیا اس اعضاء بریدہ اسلام میں کوئی کشش ہوسکتی ہے کہ یہ اپنی طرف لوگوں کو کھینچے؟ اس میں یہ طاقت ہے کہ ہندستان کی زندگی میں اپنا کوئی اثر قائم کرسکے؟ بلکہ خاکم بہ دہن میں تو یہ پوچھوں گا کہ اس نوبت پر کیا یہ ان حوادث کے مقابلے میں جن کا سیلاب روز افزوں تیزی کے

ساتھ آرہا ہے اپنے بقیہ اعضاء کو مزید قطع و برید سے اور خود اپنے آپ کو موت سے بچا سکتا ہے؟

اس کا نتیجہ یہ ہے کہ یَدۡخُلُوۡنَ فِیۡ دِیۡنِ اللّٰہِ اَفۡوَاجًا کے برعکس اب خود مسلمانوں کے گروہ میں اسلام سے بغاوت اور انحراف کی وبا پھیل رہی ہے۔ سارے ہندستان میں اور اس کے اطراف و اکناف میں کہیں بھی نظامِ اسلامی اپنی پوری مشینری کے ساتھ کام کرتا ہوا نظر نہیں آتا کہ لوگ اس کے جمال و کمال کو دیکھیں اور درخت کو اس کے پھلوں سے پہچانیں۔ وہ چیز جس کو دیکھتے ہیں وہ یہی اعضاء بریدہ اسلام ہے اور وہ سمجھتے ہیں کہ بس اسلام یہی ہے۔ اس کو دیکھ کر بعض تو علانیہ کہہ رہے ہیں کہ ہم مسلمان نہیں ہیں۔ بہت سے ایسے ہیں جو مسلمان ہونے سے بس انکار نہیں کرتے، باقی تمام باتیں ایسی کرتے ہیں کہ ان میں اور منکرین اسلام میں کوئی فرق نہیں پایا جاتا۔ بہت سوں کے دل پھر گئے ہیں مگر چوں کہ ابھی صریح بغاوت برپا نہیں ہوئی ہے اس لیے وہ منافقت کے ساتھ مسلمانوں میں شامل ہیں۔ اور بغاوت کے جراثیم پھیلا رہے ہیں تاکہ جب عام بلوہ شروع ہو جائے تب خود بھی اپنا جھنڈا لے کر کھڑے ہوں۔ کچھ لوگ صاف نہیں کہتے مگر دبی زبان سے کہہ رہے ہیں کہ نئی قومیت اور نئی تہذیب میں جذب ہونے کے لیے تیار ہو جاؤ، کیوں کہ یہ تنِ مردہ جسے تم لیے بیٹھے ہو، نہ خود تمھیں کوئی فائدہ پہنچاتا ہے اور نہ ان فوائد سے ہی متمتع ہونے دیتا ہے جو دوسروں میں جذب ہونے سے حاصل ہو سکتے ہیں۔ بعض حضرات کے نزدیک اب مسئلہ کا صحیح حل یہ ہے کہ اسلام کا باضابطہ مثلہ کر ڈالا جائے۔ وہ کہتے ہیں کہ صرف مذہبی عقائد اور مذہبی حرکت و عمل کی حد تک مسلمان رہنا چاہیے۔ باقی زندگی کا سارا پروگرام وہی اختیار کر لینا چاہیے جو غیر مسلموں نے سکھایا ہے اور جس کو غیر مسلم اختیار کر رہے ہیں، معلوم نہیں کہ یہ لوگ خود دھوکے میں ہیں یا دھوکہ دینا چاہتے ہیں۔ بہ ہر حال یہ حقیقت ہے جس کو یہ لوگ بھول گئے ہیں یا بھلا رہے ہیں کہ تمام معاملاتِ زندگی میں غیر اسلامی نظریات اختیار کرنے اور غیر اسلامی اصول پر عامل ہو جانے کے بعد مذہبی عقائد اور مذہبی حرکت و عمل قطعاً بے زور ہو جاتے ہیں۔ نہ ان پر زیادہ مدت تک ایمان باقی رہ سکتا ہے اور نہ عمل جاری رہ سکتا ہے۔ اس لیے کہ یہ عقائد اور یہ عبادات تو وہ بنیادیں ہیں جن کو اس لیے قائم کیا گیا ہے کہ زندگی کی پوری عمارت ان پر تعمیر ہو، جب یہ عمارت دوسری بنیادوں پر تعمیر ہو گئی تو ان آثارِ قدیمہ سے بے فائدہ و بے ضرورت دل چسپی کب تک باقی رہ سکے گی؟ نئے نظامِ زندگی میں جو بچہ پرورش پا کر جوان ہو گا وہ پوچھے گا کہ چند

لاحاصل عقیدوں اور چند بے نتیجہ رسموں کا یہ قلادہ کیوں میرے گلے میں ڈال رکھا ہے؟ کیوں اس قرآن کو پڑھوں اور کیوں اس پر ایمان رکھوں، جس کے سارے احکام اب بے کار ہو چکے ہیں؟ ساڑھے تیرہ سو برس پہلے جو انسان گزر چکا ہے آج اس کو میں کس لیے خدا کا رسول مانوں، جب اس زندگی میں وہ میری رہ نمائی نہیں کرتا تو محض اس کی رسالت تسلیم کر لینے سے فائدہ کیا، اور نہ تسلیم کرنے سے نقصان کیا؟ یہ نظامِ حیات جس پر میں عمل کر رہا ہوں اس میں نماز پڑھنے اور نہ پڑھنے، روزہ رکھنے اور نہ رکھنے سے کیا فرق واقع ہو جاتا ہے؟ کیا ربط ہے ان اعمال اور اس زندگی کے درمیان؟ یہ بے جوڑ پیوند میری زندگی میں آخر کیوں لگا رہے ہو؟

یہ منطقی نتیجہ ہے دین اور دنیا کی علیٰحدگی کا، اور جب یہ علیٰحدگی اصولاً اور عملاً مکمل ہو جائے گی تو یہ نتیجہ رونما ہو کر رہے گا۔ جس طرح نظامِ جسمانی سے الگ ہو جانے کے بعد قلب بے کار ہو جاتا ہے اسی طرح زندگی سے بے تعلق ہو جانے کے بعد عقائد اور عبادات کی بھی کوئی اہمیت باقی نہیں رہتی۔ عقائد اور عبادات اسلامی زندگی کو قوتِ حیات دیتے ہیں اور اسلامی زندگی عقائد و عبادات کو طاقت بہم پہنچاتی ہے جیسا کہ اوپر عرض کر چکا ہوں، ان دونوں میں ایک زندہ نظامِ جسمانی کے اعضاء کا تعلق ہے جسے منقطع کر دینے کا لازمی نتیجہ دونوں کی موت ہے۔ غیر اسلامی زندگی میں اسلامی عقائد اور عبادات کا پیوند بالکل ایسا ہی ہوگا، جیسے گوریلا کے جسم میں انسانی دماغ اور انسانی دست و پا۔

یہ نہ سمجھ لیجیے کہ اسلام کی موجودہ حالت کا یہ اثر صرف نئے تعلیم یافتہ طبقے کے ایک مختصر گروہ پر ہی مرتب ہو رہا ہے۔ نہیں آج جو لوگ سچے دل سے مسلمان ہیں، جن کے دلوں میں اس مذہب کی محبت اور عزت موجود ہے خواہ نئے گروہ کے لوگ ہوں یا پرانے گروہ کے، ان سب پر کم و بیش ان حالات کا اثر پڑ رہا ہے۔ اسلامی نظامِ زندگی کا درہم برہم ہو جانا ایک عام مصیبت ہے جس کے طبعی نتائج سے کوئی مسلمان بھی محفوظ نہیں ہے، اور نہ محفوظ رہ سکتا ہے۔ اپنی اپنی استعداد کے مطابق ہم سب کو اس میں سے حصہ مل رہا ہے اور ہمارے علماء و مشائخ بھی اس میں اتنے ہی حصہ دار ہیں جتنے مدرسوں اور کالجوں سے نکلے ہوئے لوگ۔

لیکن سب سے زیادہ خطرے میں ہمارے وہ عوام ہیں جو کروڑوں کی تعداد میں ۱۶ لاکھ مربع میل کے وسیع رقبے پر پھیلے ہوئے ہیں۔ ان کے پاس صرف اسلام کا نام باقی ہے، جس سے

ان کو غیر معمولی محبت ہے۔ نہ علمی حیثیت سے یہ غریب اس چیز سے واقف ہیں جس پر یہ اس طرح جان دے رہے ہیں اور نہ علمی حیثیت سے کوئی ایسا نظامِ زندگی موجود ہے جو انھیں غیر اسلامی اثرات سے محفوظ رکھ سکے۔ ان کی جہالت سے فائدہ اٹھا کر ہر گم راہ کرنے والا ان کے عقائد کو اور ان کی زندگی کو اسلام کی صراط مستقیم سے ہٹا سکتا ہے۔ بس انھیں یہ اطمینان دلا دینا کافی ہے کہ یہ ضلالت جو ان کے سامنے پیش کی جا رہی ہے یہی عینِ ہدایت ہے، یا کم از کم اسلام کے خلاف نہیں ہے۔ اس کے بعد آپ جس راستے پر چاہیں انھیں بھٹکا لے جا سکتے ہیں۔ خواہ وہ قادیانیت کا راستہ ہو یا اشتراکیت کا یا فسطائیت کا۔ ان کے روز افزوں افلاس اور ان کی ہول ناک معاشی خستہ حالی نے جو مسائل پیدا کر دیے ہیں ان کو موجودہ بے نظمی کی حالت میں اصولِ اسلام کے مطابق حل کرنے کی کوشش نہیں ہو رہی ہے۔ مسلمانوں میں کوئی منظم جماعت ایسی موجود نہیں جو اشتراکیت کے مقابلے میں اسلام کے معاشی و تمدنی اصولوں کو لے کر اٹھے اور ان مسائل کو حل کر کے دکھا دے جو عام لوگوں کے لیے فی الواقع بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ کروڑوں مفلس و فاقہ کش مسلمانوں کی یہ بھیڑ اشتراکی مبلغین کے لیے نہایت سہل الحصول شکار بن گئی ہے۔ بورژوا طبقے کے جن لوگوں میں حوصلہ مندی اور اقتدار کی حرص ذرا اعتدال سے بڑھی ہوئی ہوتی ہے وہ ہمیشہ سیاسی طاقت حاصل کرنے کے لیے نئی نئی تدبیریں تلاش کرتے رہتے ہیں۔ اب روسی انقلاب نے اس طبقے کے ایک گروہ کو ایک اور تدبیر سکھا دی ہے اور وہ یہ ہے کہ کسان اور مزدور کے حامی بن کر غریب عوام کو اپنے ہاتھ میں لیں۔ ان کے اندر خود غرضی، حرص اور حسد کی آگ بھڑکائیں۔ ان کے جائز حقوق سے بڑھ کر انھیں دولت میں حصہ دلوانے کا لالچ دلائیں، خوش حال طبقوں کی جائز دولت تک چھین کر ان میں تقسیم کر دینے کا وعدہ کریں۔ اور اس طرح ملک کے سوادِ اعظم کو اپنی مٹھی میں لے کر وہ اقتدار حاصل کریں جو سرمایہ داری نظام کے بادشاہوں، ڈکٹیٹروں اور کروڑ پتیوں کو حاصل ہے۔ یہ لوگ غیر مسلم عوام سے بڑھ کر مسلم عوام سے توقعات رکھتے ہیں۔ کیوں کہ معاشی حیثیت سے مسلمان زیادہ خستہ حال ہیں۔ یہ ان کے دلوں پر قبضہ کرنے کے لیے پیٹ کی طرف سے راستہ پیدا کر رہے ہیں، جو بھوکے آدمی کے جسم کا سب سے زیادہ نازک حصہ ہوتا ہے۔ یہ ان سے کہتے ہیں کہ آؤ ہم وہ طریقہ بتائیں" جس سے امیری اور غریبی مرتی ہے اور آسودہ حالی آتی ہے۔" پھر جب بے چارہ بھوکا مسلمان دو روٹیوں کی امید پر ان کی

طرف دوڑتا ہے تو یہ اسے خدا پرستی کے بہ جائے شکم پرستی کے مذہب کی تلقین کرتے ہیں اور یہ جذبہ اس کے دل میں پیدا کرتے ہیں کہ دین اور ایمان کوئی چیز نہیں، اصل روٹی ہے، وہ جس طریقے سے ملے وہی دین ہے اور اسی میں نجات ہے۔

"غریبوں، مفلسوں اور غلاموں کا کوئی مذہب اور کوئی تمدن نہیں، اس کا سب سے بڑا مذہب روٹی کا ایک ٹکڑا ہے۔ اس کا سب سے بڑا تمدن ایک پھٹا پرانا کرتا ہے۔ اس کا سب سے بڑا ایمان اس موجودہ افلاس اور نکبت سے چھٹکارا پالینا ہے، وہی روٹی اور کپڑا جس کے لیے وہ چوری تک کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے آج افلاس اور غلامی کی دنیا میں اس کا کوئی مذہب نہیں۔"

یہ ابتدائی سبق ہے مذہبِ اشتراکیت کا اور جس آن یہ سبق بے چارے جاہل و مفلس مسلمان کو دیا جاتا ہے اسی آن انھیں اس امر کا اطمینان بھی دلایا جاتا ہے کہ ہم تمھارے مذہب کو ہاتھ نہیں لگاتے۔

"مذہب اور عقائد کو ان باتوں سے کیا خطرہ؟ کیا تعلق؟ مذہب تو ہمیشہ اگر اس میں اخلاقی اور روحانی طاقت رہی ہے، تو زندہ، تابندہ اور پائندہ ہی رہا ہے[1]۔"

گزشتہ بیس سال کے اندر روسی اشتراکیت کے جو اثرات مسلمانانِ روس کی نوخیز نسلوں پر مرتب ہوئے ہیں وہ جاننے والوں سے پوشیدہ نہیں ہیں۔ یہی مستقبل مسلمانانِ ہند کے سامنے بھی دھمکیاں دیتا ہوا آ رہا ہے۔ پیٹ کی آگ متاعِ ایمان کو خاکستر کر دینے کے لیے بڑھ رہی ہے۔ ابھی تک سرچشمہ اتنا چھوٹا ہے کہ اسے ایک سلائی سے بند کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اگر غفلت کے چند سال یوں ہی گزار دیے گئے تو یہ اتنا بڑا سیلاب بن جائے گا کہ اس کے مقابلے میں ہاتھیوں کے پاؤں اکھڑ جائیں گے۔

ان حالات میں محض عیسائی مشنریوں کے ڈھنگ پر اسلام کی تبلیغ کر دینا لا حاصل ہے۔ عقائد کی اصلاح کے لیے ایک رسالہ نہیں ہزاروں رسالے اگر لاکھوں کی تعداد میں بھی شائع کر دیے جائیں تو یہ حالات رو براہ نہیں آ سکتے۔ محض زبان اور قلم سے اسلام کی خوبیوں کو بیان کر دینے سے کیا فائدہ؟ ضرورت تو اس کی ہے کہ ان خوبیوں کو واقعات کی دنیا میں سامنے لایا جائے۔

---

(۱) یہ دونوں فقرے جو یہاں نقل کیے گئے ہیں ایک مسلمان صاحب کے مضمون سے ماخوذ ہیں جو ایک کثیر الاشاعت مسلم اخبار کے کالموں میں شائع ہوا ہے۔

محض یہ کہہ دینے سے کہ اسلام کے اصولوں میں زندگی کے مسائل کا حل موجود ہے، سارے مسائل خود بہ خود حل نہیں ہو جائیں گے۔ اسلام میں بالقوۃ جو کچھ موجود ہے اس کو بالفعل بنانے کی ضرورت ہے۔ یہ دنیا کش مکش اور جدو جہد کی دنیا ہے۔ اس کی رفتار محض باتوں سے نہیں بدلی جاسکتی۔ اس کو بدلنے کے لیے انقلاب انگیز جہاد کی ضرورت ہے۔ اگر اشتراکی اپنے غلط اصولوں کو لے کر نصف صدی کے اندر دنیا کے ایک بڑے حصے میں اپنا اثر و اقتدار قائم کر سکتے ہیں۔ اگر فاشیت اپنے غیر معتدل طریقوں کو لے کر دنیا پر اپنی دھاک بٹھا سکتی ہے۔ اگر گاندھی کی اہنسا ایک غیر فطری چیز ہونے کے باوجود محض جدو جہد کے بل پر فروغ پاسکتی ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ مسلمان جن کے پاس حق اور عدل کے غیر فانی اصول ہیں۔ ایک مرتبہ پھر دنیا میں اپنا سکّہ نہ جما سکیں۔ مگر یہ سکّہ نرے وعظ و تلقین سے نہیں جم سکتا اس کے لیے سعی و عمل کی ضرورت ہے اور ان ہی طریقوں پر کام کرنے کی ضرورت ہے جن سے سنت اللہ کے مطابق دنیا میں سکّہ جما کرتا ہے۔

''انقلاب انگیز جدو جہد'' ایک مبہم لفظ ہے اس کی عملی صورتیں بہت سی ہیں، اور بہت سی ہوسکتی ہیں۔ جس قسم کا انقلاب برپا کرنا مقصود ہو اس کے لیے وہی صورت اختیار کرنی پڑے گی جو اس انقلاب کی فطرت سے مناسبت رکھتی ہو۔

ہم جو انقلاب چاہتے ہیں اس کے لیے ہمیں کوئی نئی صورت تلاش کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ انقلاب اس سے پہلے برپا ہو چکا ہے۔ جس پاک انسان محمد (ﷺ) نے پہلی مرتبہ انقلاب برپا کیا تھا وہی اس کی فطرت کو خوب جانتا تھا اور اسی کے اختیار کیے ہوئے طریقے کی پیروی کر کے آج بھی یہ انقلاب برپا کیا جاسکتا ہے۔ اس پاک ہستی کی سیرت ایک لحاظ سے معجزہ ہے، مگر دوسرے لحاظ سے اسوہ بھی ہے، وہ اخلاق، وہ تقویٰ، وہ حکمت، وہ عدالت، وہ طاقت اور شخصیت اور وہ انسانیت کبریٰ کی عظیم الشان خصوصیات اب کوئی انسان کہاں سے لاسکتا ہے؟ اس لیے اب کوئی انسان اتنا کمال درجے کا انقلاب بھی کہاں برپا کر سکتا ہے؟ اس لحاظ سے وہ معجزہ ہے اور قیامت تک کے لیے معجزہ ہے۔ لیکن اس انسانِ اکبر نے جو نمونہ چھوڑا ہے اس کا طبعی خاصّہ وہی انقلاب انگیزی ہے جس کی نظیر ساڑھے تیرہ سو برس پہلے دنیا کے سامنے آچکی ہے۔ اس نمونے کی جتنی زیادہ پیروی کی جائے گی اور جس قدر زیادہ اس سے مماثلت پیدا کی جائے گی اسی

قدر زیادہ انقلاب انگیز نتائج بھی ظاہر ہوں گے اور وہ اس پہلے انقلاب سے اتنی ہی زیادہ اقرب ہوں گے جو اصل نمونے کی طاقت سے برپا ہوا تھا۔ اس لحاظ سے وہ اسوہ ہے اور قیامت تک کے لیے اسوہ ہے۔ بیسویں صدی ہو یا چالیسویں صدی ہندستان ہو یا امریکہ یا روس، جہاں اور جس وقت چاہیں آپ اسی نوعیت کا انقلاب برپا کر سکتے ہیں بہ شرطے کہ اسی اسوۂ حسنہ کو سامنے رکھ کر کام کریں۔

رسول اللہ ﷺ نے جس طریقے سے ساڑھے تیرہ سو برس پہلے کی دنیا میں انقلاب برپا کیا تھا اس کی تفصیلات یہاں بیان کرنے کا موقع نہیں۔ یہاں صرف اس امر کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ ادارہ ''دارالاسلام[1]'' کا تخیل اسی اسوۂ پاک کے غائر مطالعے سے پیدا ہوا ہے۔

آں حضرتؐ جب مبعوث ہوئے تو روئے زمیں پر ایک شخص بھی مسلم نہ تھا۔ آپؐ نے اپنی دعوت دنیا کے سامنے پیش کی اور آہستہ آہستہ متفرق طور پر ایک ایک دو دو چار چار آدمی مسلمان ہوتے چلے گئے۔ یہ لوگ اگرچہ پہاڑ سے زیادہ مضبوط ایمان رکھتے تھے اور ایسی فدویت ان کو اسلام کے ساتھ تھی کہ دنیا ان کی نظیر پیش کرنے سے عاجز ہے، مگر چوں کہ متفرق تھے، کفار کے درمیان گھرے ہوئے تھے، بے بس اور کم زور تھے اس لیے اپنے ماحول سے لڑتے لڑتے ان کے بازو شل ہو جاتے تھے اور پھر بھی وہ ان حالات کو نہ بدل سکتے تھے جن کو بدلنے کے لیے وہ اور ان کے ہادی و مرشد فداہُ امّی وابی کوشش فرما رہے تھے۔ تیرہ سال تک حضورؐ اس طرح جدوجہد کرتے رہے اور اس مدّت میں سرفروش اہلِ ایمان کی ایک مٹھی بھر جماعت آپؐ نے فراہم کرلی۔ اس کے بعد اللہ نے دوسری تدبیر کی طرف آپؐ کی ہدایت فرمائی۔ اور وہ یہ تھی کہ ان سرفروشوں کو لے کر کفر کے ماحول سے نکل جائیں، ایک جگہ ان کو جمع کر کے اسلامی ماحول پیدا کریں۔ اسلام کا ایک گھر بنائیں جہاں اسلامی زندگی کا پورا پروگرام نافذ ہو۔ ایک مرکز بنائیں جہاں مسلمانوں میں اجتماعی طاقت پیدا ہو، ایک ایسا پاور ہاؤس بنا دیں جس میں تمام برقی طاقت ایک جگہ جمع ہو جائے اور پھر ایک منضبط طریقے سے وہ پھیلنی شروع ہو یہاں تک کہ زمین کا گوشہ گوشہ اس سے منور ہو جائے۔ مدینہ طیبہ کی جانب آپؐ کی ہجرت اسی غرض کے لیے تھی۔ تمام مسلمان جو عرب

---

(۱) اگست ۱۹۴۱ء سے یہ ادارہ ''جماعت اسلامی'' میں ضم کر دیا گیا ہے۔

کے مختلف قبیلوں میں منتشر تھے ان سب کو حکم دیا گیا کہ سمٹ کر اس مرکز پر جمع ہو جائیں۔ یہاں اسلام کو عمل کی صورت میں نافذ کر کے بتایا گیا۔ اس پاک ماحول میں پوری جماعت کو اسلامی زندگی کی ایسی تربیت دی گئی کہ اس جماعت کا ہر شخص ایک چلتا پھرتا اسلام بن گیا جسے دیکھ لینا ہی یہ معلوم کرنے کے لیے کافی تھا کہ اسلام کیا ہے اور کس لیے آیا ہے۔ ان پر اللہ کا رنگ (صِبْغَةَ اللّٰهِ وَ مَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً[1]) اتنا گہرا چڑھایا گیا کہ وہ جدھر جائیں دوسروں کا رنگ قبول کرنے کے بہ جائے اپنا رنگ دوسروں پر چڑھا دیں۔ ان میں کیرکٹر کی اتنی طاقت پیدا کی گئی کہ وہ کسی سے مغلوب نہ ہوں۔ اور جو ان کے مقابلے میں آئے ان سے مغلوب ہو کر رہ جائے۔ ان کی رگ رگ میں اسلامی زندگی کا نصب العین اس طرح پیوست کر دیا گیا کہ زندگی کے ہر عمل میں وہ مقدم ہو اور باقی تمام دنیوی اغراض ثانوی درجہ میں ہوں۔ ان کو تعلیم اور تربیت دونوں کے ذریعے سے اس قابل بنا دیا گیا کہ جہاں جائیں زندگی کے اسی پروگرام کو نافذ کر کے چھوڑیں، جو قرآن و سنت نے انھیں دیا ہے۔ اور ہر قسم کے بگڑے ہوئے حالات کو منقلب کر کے اسی کے مطابق ڈھال لیں۔

یہ حیرت انگیز تنظیم تھی جس کا ایک ایک جز گہرے مطالعے اور غور و فکر کا مستحق ہے۔ اس تنظیم میں کام کو چار بڑے بڑے شعبوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔

۱- ایک گروہ ایسے لوگوں کا تیار کیا جائے جو دین میں تفقہ حاصل کریں، جن میں یہ استعداد ہو کہ لوگوں کو دین اور اس کے احکام کو بہترین طریقے پر سمجھا سکیں: فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ وَ لِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوْٓا اِلَيْهِمْ[2] (التوبہ:۱۲۲)

۲- کچھ لوگ ایسے تیار کیے جائیں جن کی زندگیاں اسلام کے نظام العمل کو قائم کرنے اور پھیلانے کی سعی و جہد کے لیے وقف ہوں۔ جماعت کا فرض ہے کہ ان کو کسب معیشت سے بے نیاز کر دیں لیکن خود انھیں اس کی پروانہ ہو۔ چاہے معیشت کا کوئی انتظام ہو یا نہ ہو، بہ ہر حال وہ اپنے دل کی لگن سے مجبور ہوں اور ہر قسم کی مصیبتیں برداشت کر کے اس کام میں لگے رہیں جو

---

(۱) اللہ کا رنگ اختیار کرو، اس کے رنگ سے اچھا کس کا رنگ ہوگا۔

(۲) کیوں نہ ایسا کیا گیا کہ ان کے ہر گروہ میں سے ایک جماعت نکل آئی ہوتی کہ دین میں دانش و فہم پیدا کرے اور جب اپنے گروہ میں واپس جاتی تو لوگوں کو جہل و غفلت کے نتائج سے ہشیار کرتی۔

ان کی زندگی کا واحد نصب العین ہے: وَلۡتَکُنۡ مِّنۡکُمۡ اُمَّۃٌ یَّدۡعُوۡنَ اِلَی الۡخَیۡرِ وَ یَاۡمُرُوۡنَ بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَ یَنۡھَوۡنَ عَنِ الۡمُنۡکَرِ (۱) (آل عمران:۱۰۴)

۳- پوری جماعت میں یہ جذبہ پیدا کیا جائے کہ ہر شخص اعلاء کلمۃ اللہ کو اپنی زندگی کا اصل مقصد سمجھے۔ وہ اپنے دنیا کے کاروبار چلاتا رہے مگر ہر کام میں یہ مقصد اس کے سامنے ہو۔ تاجر اپنی تجارت میں، کسان اپنی زراعت میں، صنّاع اپنے پیشے کے کام میں اور ملازم اپنی ملازمت میں اس مقصد کو کبھی نہ بھولے۔ وہ ہمیشہ اس بات کو پیش نظر رکھے کہ یہ سب کام جینے کے لیے ہیں اور جینا اس ایک کام کے لیے ہے۔ وہ زندگی کے جس دائرے میں بھی کام کرے اپنے اقوال و افعال اور اپنے اخلاق اور معاملات میں اسلام کے اصول کی پابندی کرے۔ اور جہاں دنیوی فوائد میں اور اصولِ اسلام میں نقیض واقع ہو جائے وہاں پر لات مار دے اور اصول ہاتھ سے دے کر اسلام کی عزت کو بٹّہ نہ لگائے۔ پھر وہ جتنا مال اور جتنا وقت اپنی ذاتی ضروریات سے بچا سکتا ہو۔ اس کو اسلام کی خدمت میں صرف کر دے اور ان لوگوں کا ہاتھ بٹائے جنھوں نے اپنی زندگیاں اس کام کے لیے وقف کی ہیں: کُنۡتُمۡ خَیۡرَ اُمَّۃٍ اُخۡرِجَتۡ لِلنَّاسِ تَاۡمُرُوۡنَ بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَ تَنۡھَوۡنَ عَنِ الۡمُنۡکَرِ وَ تُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰہِ (۲) (آل عمران:۱۱۰)

۴- باہر کے لوگوں کو موقع دیا جائے کہ دارالاسلام میں آئیں اور اس ماحول میں رہ کر کلام اللہ کا مطالعہ کریں جہاں کی ساری زندگی اس کلام پاک کی عملی تفسیر ہے۔ کفر کے ماحول کی بہ نسبت اسلام کے ماحول میں وہ قرآن کو زیادہ بہتر سمجھیں گے اور زیادہ گہرا اثر لے کر واپس جائیں گے: وَ اِنۡ اَحَدٌ مِّنَ الۡمُشۡرِکِیۡنَ اسۡتَجَارَکَ فَاَجِرۡہُ حَتّٰی یَسۡمَعَ کَلٰمَ اللّٰہِ ثُمَّ اَبۡلِغۡہُ مَاۡمَنَہٗ (۳) (التوبہ:۶)

اس طرح صرف آٹھ برس کی قلیل مدّت میں دنیا کے اس سب سے بڑے ہادی و رہبر

(۱) ضروری ہے کہ تم میں سے ایک جماعت ایسی ہو جو بھلائی کی باتوں کی طرف دعوت دینے والی ہو۔ وہ نیکی کا حکم دے اور برائی سے روکے۔

(۲) تم بہترین امت ہو جسے لوگوں کی (ہدایت) کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ تم نیکی کا حکم دینے والے اور برائی سے روکنے والے اور اللہ پر ایمان رکھنے والے ہو۔

(۳) اگر کوئی مشرک تم سے امان مانگے تو اسے ضرور امان دو، یہاں تک کہ وہ اللہ کا کلام سن لے پھر اسے اس کے ٹھکانے تک پہنچا دو۔

نے مدینہ کے پاور ہاؤس میں اتنی زبردست طاقت بھر دی کہ دیکھتے دیکھتے اس نے سارے عرب کو منور کر دیا اور پھر عرب سے نکل کر اس کی روشنی روئے زمین پر پھیل گئی حتّٰی کہ آج ساڑھے تیرہ سو برس گزر چکے ہیں مگر وہ پاور ہاؤس اب بھی طاقت کے خزانوں سے بھرا ہوا ہے۔

خلافتِ راشدہ کے بعد جب نظامِ اسلامی میں بہت کچھ برہمی پیدا ہوگئی، تو صوفیائے اسلام نے بھی اسی طریقے کی پیروی میں جگہ جگہ خانقاہیں قائم کی تھیں۔ آج خانقاہ کا مفہوم اس قدر گر گیا ہے کہ یہ لفظ سنتے ہی انسان کے ذہن میں ایک ایسی جگہ کا تصوّر آجاتا ہے جہاں ہوا اور روشنی کا گزر نہ ہو اور صدیوں تک جنتری کا ورق نہ پلٹے مگر اصل میں یہ خانقاہ بھی اسی نمونے کی ایک نقل تھی جسے سرکار رسالت مآب ﷺ نے مدینہ میں قائم کیا تھا۔ صوفیائے کرام جن لوگوں میں اچھی استعداد پاتے تھے ان کو بیرونی دنیا کے گندے ماحول سے نکال کر کچھ مدّت تک خانقاہ میں رکھتے تھے۔ اور وہاں اعلیٰ درجہ کی تربیت دے کر انھیں اسی کام کے لیے تیار کرتے تھے جس کے لیے مرشدِ اعظمؐ اپنے صحابہؓ کو تیار کرتے تھے۔

اب جو لوگ اسلامی طرز کا انقلاب برپا کرنا چاہتے ہیں ان کو پھر اسی طریقے کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ اگر ہم ہندستان سے نکل کر کہیں ایسی آزاد فضا نہیں پا سکتے جہاں مدینہ طیّبہ کی طرح ''دارالاسلام'' بنایا جاسکے تو کم از کم ہم کو اسی ملک میں ایسی تربیت گاہیں بنانی چاہئیں جہاں خالص اسلامی ماحول پیدا کیا جائے، جہاں اخلاق اسلامی ہوں، معاشرت اسلامی ہو، عملی زندگی مسلمانوں کی سی ہو، گردوپیش ہر طرف اسلام اپنی روح اور اپنی صورت کے ساتھ نمایاں ہو، جہاں کسی چیز کے صحیح ہونے کے لیے صرف یہ دلیل کافی ہو کہ خدا اور رسولؐ نے اس کی اجازت دی ہے یا اس کا حکم دیا ہے اور کسی چیز کا غلط ہونا صرف اس دلیل سے تسلیم کیا جائے کہ خدا اور رسولؐ نے اس سے منع کیا ہے یا اسے ناپسند کیا ہے۔ جہاں یہ بغاوت اور سرکشی کا ماحول اور غیر اسلامی فضا نہ ہو جس نے ہر طرف سے ہمارا احاطہ کر رکھا ہے۔ جہاں ہم کو کم از کم اتنا اختیار تو ہو کہ بیرونی اثرات میں سے جن کو ہم روحِ اسلامی کے موافق پائیں، صرف انھیں کو داخل ہونے دیں اور جن کو منافی پائیں ان کو اپنی زندگی پر مسلط ہونے اور اپنے دل ودماغ میں نفوذ کرنے سے روک سکیں، جہاں ہم کو ایسی فضا میسر آسکے کہ مسلمان کی طرح سوچ سکیں، مسلمان کی سی نظر اپنے اندر پیدا کر سکیں، ان اسلامی صفات کو نشوونما دے سکیں جو اس دارالکفر کی مسموم آب و ہوا میں فنا ہوتی چلی جارہی ہیں۔

ان گندگیوں اور آلائشوں سے اپنی زندگی کو پاک کرسکیں جو غیر اسلامی ماحول میں آنکھیں کھولنے اور نشو ونما پانے کی وجہ سے ہمارے افکار اور اعمال میں گھس گئی ہیں جن کا شعور تک بسا اوقات ہمیں نہیں ہوتا۔ اور جن کو اگر ہم محسوس کر بھی لیتے ہیں تو ماحول کی طاقت اتنی جابر و قاہر ثابت ہوتی ہے کہ باوجود کوشش کرنے کے ہم اپنے آپ کو ان سے نہیں بچا سکتے۔ اس قسم کی تربیت گاہوں میں ایسے لوگوں کو جمع کیا جائے جو سچے دل سے اسلام کی خدمت کرنا چاہتے ہوں اور وہاں ان کو صحیح تعلیم و تربیت دے کر اس خدمت کے لیے تیار کیا جائے۔ وہاں کے کام کا نقشہ وہی ہو جو نبی ﷺ کے کام کا نقشہ تھا۔ اسی طرح کام کو چار شعبوں پر تقسیم کیا جائے اور اسی طرح ہر شعبے میں آدمیت کو اسلامیت کے سانچے میں ڈھالنے کی تدبیر کی جائے۔

۱- ایک ایسا شعبہ ہو کہ جس میں اعلیٰ درجے کی علمی استعداد کے لوگ شامل ہوں۔ ان میں سے جو لوگ علومِ دینیہ میں دستگاہ رکھتے ہوں انھیں مغربی زبانوں سے اور علومِ جدیدہ سے روشناس کیا جائے اور جن حضرات نے علومِ جدیدہ کی تحصیل کی ہو انھیں عربی زبان اور اسلامی علوم کی تعلیم دی جائے، پھر یہ لوگ قرآن اور سنت کا گہرا مطالعہ کر کے دین میں تفقہ اور بصیرت حاصل کریں، اس کے بعد ان کے مختلف گروپ بنا دیے جائیں۔ ہر گروپ ایک ایک شعبۂ علم کو لے کر اس میں اسلام کے اصول و نظریات کو جدید طرز پر مرتّب کرے، زندگی کے جدید مسائل کو سمجھے اور اصولِ اسلام کے مطابق ان کا حل تلاش کرے۔ علوم کی بنیاد میں جو مغربی نقطۂ نظر پیوست ہو گیا ہے اس کو نکال کر اسلام کے نقطۂ نظر سے علوم کو از سرِ نو مدوّن کرے اور اپنی تحقیقات سے ایسا صالح لٹریچر پیدا کرے جو اسلام کی موافقت میں ایک ذہنی انقلاب برپا کرنے کی طاقت رکھتا ہو۔

۲- دوسرا شعبہ ایسا ہو جس میں خدمت اسلام کے لیے اچھے کارکن تیار کرنے کی کوشش کی جائے، پاکیزہ اخلاق، مضبوط سیرت، دُھن کے پکّے اور اپنے نصب العین کے لیے سب کچھ قربان کر دینے والے لوگ جو ایک زبردست انقلابی پارٹی کی صورت میں منظم ہوں۔ جن کی زندگی سادہ ہو، جن میں جفاکشی ہو، جن میں پورا ضبط و نظم پایا جائے اور جن کی عملی سیرت ٹھیٹھ مسلمان کی سی ہو۔ یہ پارٹی اسلام کے اصولوں پر ایک نئے اجتماعی نظام (Socialorder) اور ایک نئی تہذیب (Civilization) کی تعمیر کا پروگرام لے کر اٹھے اور عامۂ خلائق کے سامنے اپنے پروگرام کو پیش

کر کے زیادہ سے زیادہ سیاسی طاقت فراہم کرے اور بالآخر حکومت کی مشین پر قابض ہو جائے تاکہ ظلم و جور کی حکومت کو عدل کی حکومت میں تبدیل کیا جائے۔

۳- تیسرے شعبے میں ایسے لوگ ہوں جو صرف تھوڑی مدت کے لیے تربیت گاہ میں رہ کر واپس جانا چاہتے ہوں انھیں صحیح علم اور اخلاقی تربیت دے کر چھوڑ دیا جائے کہ جہاں چاہیں رہیں مگر مسلمان کی طرح رہیں دوسروں سے متاثر ہونے کے بہ جائے ان پر اپنا اثر ڈالیں۔ اپنے اصولوں میں سخت ہوں، اپنے عقائد میں مضبوط ہوں، بے مقصد زندگی نہ بسر کریں، ایک نصب العین ہر حال میں ان کے سامنے ہو، پاک طریقوں سے روزی کمائیں اور ان لوگوں کو ہر ممکن طریقے سے مدد دینے کے لیے تیار رہیں جو شعبہ نمبر۲ کے تحت کام کر رہے ہوں۔ یہ ان کو مالی مدد بھی دیں، ان کے کاموں میں عملاً بھی شریک ہوں اور جہاں رہیں وہاں کی فضا کو انقلابی پارٹی کی موافقت میں تیار بھی کرتے رہیں۔

۴- چوتھا شعبہ ایسے مسلمانوں اور غیر مسلموں کے لیے ہو جو محض عارضی طور پر تربیت گاہ میں آکر کچھ عملی استفادہ کرنا چاہیں یا وہاں کی زندگی کا مطالعہ کرنے کے خواہش مند ہوں، ان لوگوں کو ہر قسم کی سہولتیں بہم پہنچائی جائیں تاکہ وہ اسلام اور اس کی تعلیم کا گہرا نقش لے کر واپس جائیں۔

یہ ایک سرسری سا خاکہ ہے۔ اس نظام کا جو ہمارے نزدیک اسلامی انقلاب برپا کرنے کے لیے ایک ضروری مقدمے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس نظام کی کام یابی کا انحصار تمام تر اس پر ہے کہ یہ اپنی رُوح اور اپنے جوہر میں مدینہ طیبہ کے اس مثالی نظام کے ساتھ زیادہ سے زیادہ مماثلت پیدا کرے جو نبی ﷺ نے قائم کیا تھا۔

مدینہ طیبہ سے مماثلت پیدا کرنے کا مفہوم کہیں یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ ہم ظاہری اشکال میں مماثلت پیدا کرنا چاہتے ہیں اور دنیا اس وقت تمدن کے جس مرتبہ پر ہے اس سے رجعت کر کے اس تمدنی مرتبہ پر واپس جانے کے خواہش مند ہیں، جو عرب میں ساڑھے تیرہ سو برس پہلے تھا۔ اتباعِ رسول کا یہ مفہوم ہی سرے سے غلط ہے اور اکثر دین دار لوگ غلطی سے اس کا یہی مفہوم لیتے ہیں۔ ان کے نزدیک سلف صالح کی پیروی اس کا نام ہے کہ جیسا لباس وہ پہنتے تھے ویسا ہی ہم پہنیں۔ جس قسم کے کھانے وہ کھاتے تھے اسی قسم کے کھانے ہم بھی کھائیں۔ جیسا طرزِ معاشرت ان کے گھروں میں تھا بعینہٖ وہی طرزِ معاشرت ہمارے گھروں میں بھی ہو، تمدن و حضارت کی جو

حالت ان کے عہد میں تھی اس کو ہم بالکل متحجر (Foscilized) صورت میں قیامت تک باقی رکھنے کی کوشش کریں اور ہمارے اس ماحول سے باہر کی دنیا میں جو تغیرات واقع ہو رہے ہیں ان سب سے آنکھیں بند کر کے ہم اپنے دماغ اور اپنی زندگی کے ارد گرد ایک حصار کھینچ لیں جس کی سرحد میں وقت کی حرکت اور زمانے کے تغیر کو داخل ہونے کی اجازت نہ ہو۔ اتباع کا یہ تصور جو دورِ انحطاط کی کئی صدیوں سے دین دار مسلمانوں کے دماغوں پر مسلط رہا ہے۔ درحقیقت روحِ اسلام کے بالکل منافی ہے۔ اسلام کی یہ تعلیم ہرگز نہیں ہے کہ ہم جیتے جاگتے آثارِ قدیمہ بن کر رہیں اور اپنی زندگی کو قدیم تمدن کا ایک تاریخی ڈرامہ بنائے رکھیں۔ وہ ہمیں رہبانیت اور قدامت پرستی نہیں سکھاتا اس کا مقصد دنیا میں ایک ایسی قوم پیدا کرنا نہیں ہے جو تغیر و ارتقاء کو غلط راستوں سے پھیر کر صحیح راستوں پر چلانے کی کوشش کرے۔ وہ ہم کو قالب نہیں دیتا بلکہ روح دیتا ہے اور چاہتا ہے کہ زمان و مکان کے تغیرات سے زندگی کے جتنے بھی مختلف قالب قیامت تک پیدا ہوں ان سب میں یہی روح بھرتے چلے جائیں۔ مسلمان ہونے کی حیثیت سے دنیا میں ہمارا اصلی مشن یہی ہے ہم کو ''خَیۡرَ اُمَّۃٍ'' جو بنایا گیا ہے تو یہ اس لیے نہیں کہ ہم ارتقاء کے راستے میں آگے بڑھنے والوں کے پیچھے عقب لشکر (Rearguard) کی حیثیت سے لگے رہیں بلکہ ہمارا کام امامت و رہ نمائی ہے۔ ہم مقدمۃ الجیش بننے کے لیے پیدا کیے گئے ہیں اور ہمارے خَیۡرَ اُمَّۃٍ ہونے کا راز اُخۡرِجَتۡ لِلنَّاسِ میں پوشیدہ ہے۔

رسول اللہ ﷺ اور آپ کے اصحاب کا اصلی اسوہ جس کی پیروی ہمیں کرنی چاہیے۔ یہ ہے کہ انھوں نے قوانینِ طبیعی کو قوانینِ شرعی کے تحت استعمال کر کے زمین میں خدا کی خلافت کا پورا پورا حق ادا کر دیا۔ ان کے عہد میں جو تمدن تھا انھوں نے اس کے قالب میں اسلامی تہذیب کی روح پھونکی۔ اس وقت جتنی طبعی قوتوں پر انسان کو دسترس حاصل ہو چکی تھی ان سب کو انھوں نے اس تہذیب کا خادم بنایا اور غلبہ و ترقی کے جس قدر وسائل تمدن نے فراہم کیے تھے ان سے کام لینے میں وہ کفار اور مشرکین سے سبقت لے گئے تا کہ خدا سے بغاوت کرنے والوں کی تہذیب کے مقابلے میں خدا کی خلافت سنبھالنے والوں کی تہذیب کام یاب ہو۔ اسی چیز کی تعلیم خدا نے اپنی کتاب میں ان کو دی تھی کہ اَعِدُّوۡا لَهُمۡ مَا اسۡتَطَعۡتُمۡ مِنۡ قُوَّةٍ۔ ان کو یہ سکھایا گیا تھا کہ خدا کی پیدا کی ہوئی قوتوں سے کام لینے کا حق کافر سے زیادہ مسلم کو پہنچتا ہے بلکہ اس کا اصلی حق دار مسلم

ہی ہے۔ پس نبیؐ واصحابِ نبی کا صحیح اتباع یہ ہے کہ تمدن کے ارتقاء اور قوانینِ طبعی کے اکتشافات سے اب جو وسائل پیدا ہوئے ہیں ان کو ہم اسی طرح تہذیبِ اسلامی کا خادم بنانے کی کوشش کریں جس طرح صدرِ اوّل میں کی گئی تھی۔ نجاست اور گندگی جو کچھ ہے وہ ان وسائل میں نہیں ہے بلکہ اس کافرانہ تہذیب میں ہے جو ان وسائل سے فروغ پا رہی ہے۔ ریڈیو بہ جائے خود ناپاک نہیں ہے ناپاک وہ تہذیب ہے جو ریڈیو کے ڈائرکٹر کو داروغۂ اربابِ نشاط یا ناشرِ کذب وافتراء بناتی ہے۔ ہوائی جہاز ناپاک نہیں ہے ناپاک وہ تہذیب ہے جو ہوا کے فرشتے سے خدائی قانون کے بہ جائے شیطانی اغوا کے تحت خدمت لیتی ہے، سینما ناپاک نہیں ہے ناپاک دراصل وہ تہذیب ہے جو خدا کی پیدا کی ہوئی اس طاقت سے فحش اور بے حیائی کی اشاعت کا کام لیتی ہے۔ اور اس ناپاک تہذیب کو فروغ اسی لیے ہو رہا ہے کہ اس کو فروغ دینے کے لیے خدا کی بخشی ہوئی تمام ان طاقتوں سے کام لیا جارہا ہے جو اس وقت انسان پر منکشف ہوئی ہیں۔ اب اگر ہم اس فرض سے سبک دوش ہونا چاہتے ہیں جو الٰہی تہذیب کو فروغ دینے کے لیے ہم پر عائد ہوتا ہے تو ہمیں بھی انھی طاقتوں سے کام لینا چاہیے۔ یہ طاقتیں تو تلوار کی طرح ہیں کہ جو اس سے کام لے گا، وہی کام یاب ہوگا خواہ وہ ناپاک مقصد کے لیے کام لے یا پاک مقصد کے لیے۔ پاک مقصد والا اگر اپنے مقصد کی پاکی ہی کو لیے بیٹھا رہے اور تلوار استعمال نہ کرے تو اس کا قصور ہے اور اس قصور کی سزا اسے بھگتنی پڑے گی۔ کیوں کہ اس عالمِ اسباب میں خدا کی جو سنت ہے اسے کسی کی خاطر نہیں بدلا جاسکتا۔

اس تصریح سے یہ واضح ہوجاتا ہے کہ یہ تحریک جسے میں پیش کر رہا ہوں نہ تو کوئی ارتجاعی (Reactionary) تحریک ہے اور نہ اس قسم کی ارتقائی تحریک ہے، جس کے پیشِ نظر صرف مادّی ارتقاء ہو۔ میرے پیشِ نظر جو تربیت گاہ ہے اس کے لیے گروکل، کانگڑی، ستیہ گرہ، آشرم، شانتی نکیتن اور دیال باغ میں کوئی نمونہ نہیں ہے۔ اور اسی طرح جس انقلابی پارٹی کا تصوّر میرے ذہن میں ہے اس کے لیے اٹلی کی فاشیسٹ اور جرمنی کی نیشنل سوشلسٹ پارٹی میں بھی کوئی نمونہ نہیں ہے۔ اس کے لیے اگر کوئی نمونہ ہے تو وہ صرف مدینۃ الرسول اور حزب اللہ میں ہے جسے نبی عربی ﷺ نے مرتب کیا تھا۔

(ترجمان القرآن شوال ۱۳۵۶ھ دسمبر ۱۹۳۷ء)